الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ
آدمی کھوئی ہوئی چیز کی خاطر
پائی ہوئی چیز کو بھی کھو دے

نومبر ۱۹۹۰ شمارہ ۱۶۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۸ نومبر ۱۹۹۰

فہرست

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

عجیب فرق

جو لوگ قرآن کو مان کر قرآن کے دین کو اختیار کریں، ان کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ ایسے لوگوں کا نام مُسلم رکھا گیا ہے: ھو سماکم المسلمین (الحج ۷۸) یہ بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی سادہ سی چیز دوسرے مذہب والوں کو حاصل نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کو جو لوگ مانتے ہیں، ان کو یہودی (Jews) کہا جاتا ہے۔ مگر ان کی مقدس کتاب بائبل میں کہیں بھی یہ درج نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ میرے ماننے والوں کا نام یہودی ہوگا۔ اسی طرح مسیح علیہ السلام کے دین کو جو لوگ مانتے ہیں ان کو مسیحی (Christians) کہا جاتا ہے۔ مگر انجیل (نئے عہد نامہ) میں کہیں بھی یہ نہیں ملتا کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے ماننے والوں کا نام مسیحی رکھا تھا۔

یہی حال ہندوازم یا ہندو دھرم کے ماننے والوں کا ہے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں۔ مگر اپنی جن کتابوں کو وہ مقدس مانتے ہیں، ان میں کہیں بھی یہ لکھا ہوا نہیں ملتا کہ اِس دھرم کو جو لوگ مانیں، ان کا نام ہندو ہوگا اور انھیں ہندو کہا جائے گا۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۰ اگست ۱۹۹۰) میں اندرا رودرمنڈ (Indira Rothermund) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ——— ہندو دھرم میں فنڈمنٹلزم کے لیے کوئی جواز نہیں:

Fundamentalism has no legitimacy in Hindu dharma

اس مضمون میں درج ہے کہ ایک ممتاز ہندو مورخ نے بتایا ہے کہ لفظ ہندو کسی بھی قدیم ہندستانی متن میں نہیں پایا جاتا۔ یہ لفظ عرب حملہ آوروں نے آٹھویں صدی عیسوی میں وضع کیا تھا۔ یہ لفظ جغرافی معنوں میں تھا اور وہ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا جو دریائے سندھ کے ساحل پر یا اس کے اُس پار رہتے تھے:

An eminent historian has pointed out that the word Hindu is not found in many ancient Indian texts but was coined by the invading Arabs in the 8th century AD and was a geographical term applied to people who lived on or beyond the banks of the river Sindhu or Indus (p. 9).

نہ صرف نام بلکہ ہر بات جو اسلام میں دین کا جز سمجھی جاتی ہے ، اس کی ٹھوس بنیاد خود قرآن اور حدیث میں موجود ہے ۔ جب کہ دوسرے مذاہب میں بہت بڑے پیمانہ پر تبدیلیاں ہوئی ہیں ۔ اس لیے وہ آج جن چیزوں کو مانتے ہیں ، ان کے لیے ان کے پاس ٹھوس تاریخی بنیاد موجود نہیں ۔

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے اور دوسرے تمام مذاہب غیر محفوظ مذہب ۔ اسلام اپنے پیچھے مکمل تاریخی استناد رکھتا ہے ، جب کہ دوسرے مذاہب تاریخی استناد کی زمین سے محروم ہیں ۔ اسلام پورے معنوں میں ایک سائنٹفک مذہب ہے ، اور دوسرے تمام مذاہب بے ثبوت عقیدہ کی حیثیت رکھتے ہیں ، ان کو ، جدید علمی معنوں میں ، سائنٹفک مذہب کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ۔ اسلام آج کا مذہب ہے ، جب کہ دوسرے مذاہب دور قدیم کے مذہب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے مذاہب اصلاً غلط تھے ۔ اپنی ابتدائی اصل کے اعتبار سے تمام مذاہب سچے تھے ۔ مگر بعد کے زمانہ میں وہ اپنی اصل صورت کو باقی نہ رکھ سکے ، اس لیے وہ علمی اور تاریخی اعتبار سے قابل اعتبار نہ رہے ۔

اسلام کو یہ امتیازی صفت اللہ تعالے نے اس لیے دی تھی کہ اہل عالم کے درمیان اس کی تبلیغ کا کام آسان ہو جائے ۔ جب مذاہب کی لمبی فہرست میں ایک ہی مذہب مستند ہو اور بقیہ تمام مذاہب غیر مستند ، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب طالبین مذہب کے لیے انتخاب کا معاملہ آسان ہوگیا ۔ اب ان کے لیے تلاش وجستجو کا مسئلہ نہ رہا ۔ اب تو میدان میں ایک ہی صداقت ہے جس کو انھیں بلا بحث اختیار کر لینا چاہیے ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس واحد سچائی کو دنیا کے سامنے تو پیش نہ کیا ، البتہ اس کے واحد سچائی ہونے پر فخر کرنے لگے ۔ انھوں نے اسلام کی امتیازی شان کو اس کی تبلیغ کے لیے استعمال نہیں کیا ، بلکہ اس کو اپنے لیے سرمایۂ فخر بنالیا ۔

مسلمان اگر اسلام کی تبلیغ کرتے تو انھیں اللہ تعالے کے یہاں اس کا انعام ملتا ۔ مگر اپنی دیواروں پر " ہم کو اسلام پر فخر ہے " لکھ کر وہ صرف اپنے آپ کو مجرم ثابت کر رہے ہیں ۔

مقصدی کردار

۶ ستمبر ۱۹۹۰ء کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسور اٹھایا تو دوسری طرف ایک خاتون انیتا پرتاپ (Anita Pratap) بول رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ نئی دہلی میں وہ ٹائم میگزین (نیویارک) کی اسپشل کرسپانڈنٹ ہیں۔ اور مجھ سے "اسلام میں عورت کا مقام" کے مسئلہ پر معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

مقررہ وقت پر وہ دفتر میں آئیں۔ ان کے پاس انگریزی کا ایک ٹائپ کیا ہوا آرٹیکل تھا۔ یہ اسلام میں عورت کی حیثیت کے بارہ میں تھا، اور اس کا عنوان تھا ـــــــ پردہ کے پیچھے :

Behind the veil

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ یہ آرٹیکل ہمارے پاس ٹائم کے صدر دفتر نیویارک سے آیا ہے۔ ہمارا میگزین ایک مضمون چھاپنا چاہتا ہے جس میں عورت کے بارہ میں اسلام کی تعلیمات بتائی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے صدر دفتر نے کچھ مسلم ملکوں میں ٹائم کے نمائندوں کو لکھا کہ وہ موضوع سے متعلق ضروری معلومات حاصل کر کے بھیجیں۔ ان معلومات کو سامنے رکھ کر نیویارک کے اڈیٹر نے یہ آرٹیکل تیار کیا۔ اب اس آرٹیکل کو دوبارہ مختلف ملکوں میں ٹائم کے نمائندوں کے پاس بھیجا گیا ہے کہ وہ اپنے یہاں کے مستند علماء سے مل کر اس کے اندراجات کی جانچ کریں اور ان کی تصدیق یا تصحیح کر کے دوبارہ صدر دفتر (نیویارک) کو بھیجیں۔ ہماری ان ترمیمات کو سامنے رکھ کر نیویارک کا ایڈیٹر آرٹیکل کو دوبارہ لکھے گا اور اِس کے بعد اُس کو ٹائم میں چھاپا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کی چیزوں میں ہمارا طریقہ "چیک اینڈ ری چیک" کا ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایک مضمون کی تیاری میں آپ لوگ اتنا زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں خاتون کرسپانڈنٹ نے کہا کہ ہمارا میگزین (ٹائم انٹرنیشنل) ساری دنیا میں جاتا ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں پڑھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس کا تحمل نہیں کر سکتے کہ ہم اس میں کوئی غلطی کریں :

We can't afford to make any mistakes.

ٹائم کے نمائندہ کا یہ جملہ بے حد سبق آموز ہے۔ ٹائم کا مقصد یہ ہے کہ وہ ساری دنیا میں اپنے پرچہ کے لیے خریدار حاصل کرے۔ اسی لیے اس کا نام ٹائم انٹرنیشنل رکھا گیا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے

ضروری ہے کہ اس کا ہر شمارہ لوگوں کو غلطیوں سے خالی دکھائی دے۔ اگر لوگ محسوس کریں کہ اس کی رپورٹیں اور اس کی معلومات غلط ہوتی ہیں تو لوگ اس کی خریداری کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ ٹائم اپنے پرچہ کو ساری دنیا میں پھیلانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ٹائم اپنے پرچہ کی غیر مقبولیت کا تحمل نہیں کر سکتا، اس لیے وہ اِس کا تحمل بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے صفحات میں ایسی باتیں چھاپے جو غلط یا خلاف واقعہ ہوں۔ اور نتیجۃً لوگوں کو اس سے دور کر دینے کا سبب بن جائیں۔

یہی نفسیات زیادہ بڑے پیمانے پر دین کے داعی کی ہوتی ہے۔ داعی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے دین کو خدا کے تمام بندوں کے لیے قابل قبول بنائے۔ اس مقصد کے پیش نظر داعی ہر ممکن تدبیر کے ذریعہ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان ایسی کوئی بات پیش نہ آئے جو مدعو کو دین حق سے بیزار کر دے، جس کا نتیجہ اس صورت میں نکلے کہ خدا کا دین مدعو کو مشتبہ دکھائی دینے لگے، وہ مدعو کی نظر میں قابلِ قبول نہ رہے۔

اس مقصد کے لیے داعی ہر قسم کی "غلطی" سے بچنے کا مکمل اہتمام کرتا ہے۔ وہ مدعو کی پسندیدہ زبان (ابراہیم ۴) میں کلام کرتا ہے۔ وہ دین کو اس کے سامنے قول بلیغ (النساء ۶۳) کے اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ وہ مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر (ابراہیم ۱۲) کرتا ہے۔ وہ تالیف قلب (التوبہ ۶۰) کے ذریعہ اس کے دل کو نرم کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے پاک (المدثر ۴) کرتا ہے۔ وہ آخری حد تک مدعو کا خیر خواہ (الاعراف ۹) بن جاتا ہے۔ حتی کہ بعض اوقات وہ ایک صحیح اور جائز بات کے سلسلہ میں بھی مدعو کی ضد کو مان لیتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے حدیبیہ کے موقع پر مدعو کے اصرار پر لفظ "رسول اللہ" کو کاغذ سے مٹا دیا۔

ٹائم میگزین کے نمائندہ نے کہا کہ ہم غلطیوں کا تحمل نہیں کر سکتے۔ یہی بات ایک داعی کو مزید شدت کے ساتھ کہنا ہے۔ داعی کا احساس یہ ہونا چاہیے کہ میں ایسی کسی بات کا تحمل نہیں کر سکتا جو مدعو کو میرے پیغام سے دور کر دے۔ میں یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری لوں گا کہ مدعو کو اپنے پیغام حق کے بارہ میں بدظن نہ ہونے دوں۔ میں ہر اس قول یا فعل سے بچوں گا جو مدعو کے اندر مخالفانہ نفسیات پیدا کرے اور میری بات کو اس کے لیے ناقابل قبول بنا دے۔

زیادہ بڑی واپسی

ڈاکٹر گوپال سنگھ ۲۹ نومبر ۱۹۱۷ کو ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۸ اگست ۱۹۹۰ کو نئی دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ مختلف زبانیں جانتے تھے۔ وہ بلغاریہ اور برٹش گائنا میں ہندستان کے سفیر تھے۔ آخر میں وہ ناگالینڈ اور گوا کے گورنر بنے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے عہدوں پر فائز ہوئے۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ نے اپنی موت سے صرف چند دن پہلے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنے وہ تلخ تجربات لکھے ہیں جو انھیں بطور گورنر حاصل ہوئے۔ ان کا یہ مضمون ہندستان ٹائمس (۱۲ اگست ۱۹۹۰) میں ذیل کے عنوان کے تحت شائع ہوا ہے :

An ex-Governor speaks out

مثال کے طور پر انھوں نے لکھا ہے کہ مجھے ناگالینڈ میں گورنر کی حیثیت سے بھیجا گیا۔ ناگالینڈ میں ۹۰ فی صد عیسائی ہیں۔ وہاں ترقیاتی کام رکا ہوا تھا، میں نے بہت سے کام شروع کرائے۔ بجلی کی فراہمی کا انتظام کیا۔ پیپر مل بنوائی جس پر ۸۷ کرور روپے خرچ ہوئے۔ شوگر مل کو ترقی دی۔ ایک نئی یونی ورسٹی قائم کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں ریاست کی ترقی کے لیے محنت کرنے میں لگا ہوا تھا۔ مگر میں اپنے عہدہ کی مدت پوری کرنے سے پہلے عہدہ سے واپس بلا لیا گیا :

But, I was recalled, before time!

ڈاکٹر گوپال سنگھ گورنری کے عہدہ سے واپس بلائے جانے کی شکایت تحریر کر رہے تھے، مگر انھیں معلوم نہ تھا کہ اس کے صرف چند دن بعد وہ خود موجودہ دنیا سے واپس بلائے جانے والے ہیں۔ کیسا عجیب ہے انسان کا یہ معاملہ۔ وہ ایک "واپسی" کو جانتا ہے، مگر دوسری زیادہ بڑی واپسی کی اس کو خبر نہیں۔

ہر انسان جو دنیا میں آیا ہے وہ ایک دن یہاں سے واپس جانے والا ہے۔ آدمی اس دنیا میں اسی لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ مر کر دوبارہ یہاں سے چلا جائے۔ وہ عالم آخرت میں اپنے قول وعمل کا حساب دینے کے لیے حاضر کر دیا جائے۔ یہی کسی آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، مگر یہی وہ مسئلہ ہے جس کے لیے کوئی آدمی فکر مند نہیں۔

بامعنی زندگی

ڈاکٹر جارودی (Roger Garaudy) فرانس میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ وہ عیسائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ۱۹۳۳ء کے مشہور اقتصادی بحران نے ان کے ذہن پر اثر ڈالا۔ وہ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے، تاہم ان کو ذہنی اطمینان نہ مروجہ مسیحیت میں ملا اور نہ کمیونزم میں۔ بعد کو انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور ۱۹۸۲ء میں اسلام قبول کر لیا۔

ڈاکٹر جارودی کو ۱۹۸۶ء میں شاہ فیصل فاؤنڈیشن کے تحت خدمت اسلام کا نصف ایوارڈ دیا گیا۔ اس موقع پر ریاض میں ایک تقریب ہوئی جس میں ڈاکٹر جارودی نے اپنے حالات کے بارہ میں مفصل تقریر کی۔ یہ تقریر انھوں نے فرانسیسی زبان میں کی تھی۔ اس کا مکمل عربی ترجمہ سعودی اخبار الریاض (۲ رجب ۱۴۰۶ھ، ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر جارودی کا ذہن جب کمیونزم سے ہٹا اور وہ مذہب کی جانب مائل ہوئے تو ابتداءً ان کا میلان مسیحیت کی طرف ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر اسلام قبول کر لیا۔ اسلام میں انھوں نے اپنے پورے ذہنی اطمینان کو پا لیا۔ الحاد سے اسلام کی طرف اپنے اس سفر کو بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے ایسا اس لیے کیا تاکہ کرکے گارڈ (Kierkegaard) کے الفاظ میں، اپنی زندگی کو بامعنی بنا سکوں (حتی اعطی لحیاتی معنی)

زندگی میں معنویت کی تلاش ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ ہر آدمی کے اندر لازمی طور پر اور پیدائشی طور پر پایا جاتا ہے۔ اپنی اس اندرونی تلاش کا جواب پانے کے لیے وہ ہر طرف دوڑتا ہے۔ مگر دوسری تمام چیزوں میں اس کا جواب یا تو سرے سے موجود نہیں ہے یا اگر ہے تو جزئی طور پر ہے۔ اس لیے دوسری چیزوں میں انسان کو یہ تسکین نہیں ملتی کہ اس نے اپنی تلاش کا صحیح اور کامل جواب پا لیا ہے۔

اس تلاش کا صحیح اور مکمل جواب صرف خدا کے محفوظ دین ——— اسلام میں موجود ہے۔ اسلام کی یہ امتیازی صفت اس کی دعوتی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

موت کے آگے

ایم ایس اوبرائے ہندستان میں ہوٹل کے بزنس میں سب سے ممتاز شخص گنے جاتے ہیں۔ وہ ایک "ہوٹل ایمپائر" کے مالک ہیں اور نہ صرف ہندستان کے مختلف شہروں میں ان کے ہوٹل قائم ہیں، بلکہ بیرونی دنیا میں بھی ان کے بڑے بڑے ہوٹل چل رہے ہیں۔ مسٹر اوبرائے ۱۵ اگست ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے۔ اب ۹۰ سال کی عمر کو پہنچ کر وہ دہلی کے قریب ایک فارم میں سادہ طور پر رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا فارم میری پناہ گاہ ہے، وہ مجھ کو سکون دیتا ہے:

My farm is my refuge and gives me solace.

ٹائمس آف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن (۱۲ اگست ۱۹۹۰ء) میں اپنی زندگی کی کہانی بتاتے ہوئے اس کو انھوں نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے ــــــ اپنی زندگی کی شام کو پہنچ کر مجھے کوئی افسوس نہیں۔ یہ جان کر مجھے راحت ملتی ہے کہ اپنے طریقہ کے مطابق، میں اس قابل ہو سکا کہ ضرورت مند لوگوں کی مدد کروں، اور یہ کہ جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ میرے ملک کی عزت میں اضافہ کا سبب بھی بنا۔ اس سے زیادہ کوئی شخص اور کیا تمنا کر سکتا ہے:

In the evening of life, I have few regrets and there is comfort in knowing that I have been able to, in my humble way, help people in need and that whatever I have achieved has also helped to raise the prestige of my country. What more could any man have wished for?

ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ایک شخص جو ملک کے لیے جئے، وہ اپنی آخر عمر میں پہنچ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جس کے لیے جیا اس کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص خدا کے لیے جئے، اس کا احساس آخر عمر میں یہ ہوگا کہ وہ جس ہستی کے لیے جیا، وہ ہستی اس کے آگے ہے۔ پہلے شخص کو موت کے آگے صرف خلا نظر آئے گا، اور دوسرے شخص کو موت کے آگے امید سے بھری ہوئی ایک پوری دنیا دکھائی دے گی۔

پھر کیوں نہ آدمی خدا کے لیے جئے۔ کیوں وہ غیر خدا کے لیے جئے جس کا آخری انجام صرف مایوسی اور ناامیدی ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

بند ذہن

یونانی فلسفی ارسطو (۳۲۲ - ۳۸۴ ق م) نے لکھا ہے کہ گول دائرہ معیاری دائرہ ہے اور وہ جیومٹری کی کامل صورت ہے۔ اس مفروضہ کی بنیاد پر ارسطو نے کہا کہ فطرت (نیچر) کا ہر کام چوں کہ معیاری ہوتا ہے، اس لیے فطرت آسمانی اجرام کو جن دائروں میں گھما رہی ہے، وہ صرف گول دائرہ ہی ہو سکتا ہے۔

ارسطو کا یہ نظریہ قدیم زمانہ میں تمام لوگوں کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا۔ قدیم زمانہ میں ہیئت کے جو نظام بنائے گئے، مثلاً بطلیموس کا نظام، کوپرنیکس کا نظام، ٹائیکو براہے کا نظام، سب میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ آسمانی اجرام (نظام شمسی کے سیارے) سب کے سب خلا کے اندر گول دائروں میں گھومتے ہیں۔

کپلر (Johannes Kepler) غالباً پہلا شخص ہے جس نے اس کے خلاف سوچا۔ اس نے حساب لگا کر ۱۶۰۹ میں بتایا کہ مریخ کی گردش سورج کے گرد گول دائرہ میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ بیضوی مدار (elliptical orbit) میں گھومتا ہے۔ اس نے پیشین گوئی کی کہ دوسرے تمام سیارے جو سورج کے گرد گھومتے ہیں، وہ بھی بیضوی شکل ہی میں گھومتے ہیں۔ کپلر کا یہ نظریہ آج ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا ہے۔

قدیم ہیئت داں دو ہزار سال تک گول دائرہ کے تصور میں گم رہے۔ وہ سیاروں کی گردش کے بارہ میں دوسرے نہج پر سوچ نہ سکے۔ اس کی وجہ ارسطو کے نظریہ کی عظمت تھی۔ اس نظریہ کو انھوں نے بلا بحث ایک مسلّم حقیقت مان لیا۔ اس بنا پر ان کا ذہن کسی اور انداز میں کام نہیں کر پاتا تھا۔

یہ صرف قدیم زمانہ کی بات نہیں، یہ ہر دور کی بات ہے۔ ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ بعض خیالات آدمی کے دماغ پر اتنا زیادہ چھا جاتے ہیں کہ ان سے نکل کر آزادانہ طور پر سوچنا آدمی کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ مذہبی دائرہ میں بھی ہوتا ہے اور غیر مذہبی دائرہ میں بھی۔ یہ بند ذہن ہر قسم کی ترقی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

تبدیلی کا اصول

اسلام سے پہلے عرب کے زمانہ کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ایک بار مکہ کے لوگوں میں جھگڑا ہوا۔ یہاں تک کہ جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ جھگڑا اس بات پر تھا کہ مکہ کے بڑے مناصب (السقایۃ، الحجابۃ، اللواء، الندوۃ) کس کے پاس رہیں۔ آخر کچھ سنجیدہ لوگوں کی کوشش سے اس پر صلح ہو گئی کہ حجابہ اور لواء اور ندوہ بنو عبدالدار کے پاس رہے۔ اور سقایہ اور رفادہ بنو عبد مناف کو دیدیا جائے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں:

فلم یزالوا علیٰ ذلک حتی جاء اللہ تعالیٰ بالاسلام۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ماکان من حلف فی الجاھلیۃ فان الاسلام لم یزدہ الا شدۃ
(سیرۃ ابن ہشام، ۱/ ۱۴۴)

وہ لوگ اس پر قائم تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام بھیجا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو بھی معاہدہ تھا، اسلام نے اس کے سوا کچھ اور نہیں کیا ہے کہ اس کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا ہے۔

اس سے اسلام کی پالیسی کا ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ اسلام سے پہلے مکہ کے لوگ مشرک تھے۔ ان کا یہ فیصلہ دورِ شرک کا کیا ہوا فیصلہ تھا جو اسلام کے مسلّمہ دشمن رہ چکے ہیں۔ ان سب کے باوجود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ کو نہیں بدلا۔ بلکہ اس کے مزید استحکام کا اعلان فرما دیا۔

مخالف پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اس کے تمام پچھلے فیصلوں کو بدلنا انتہائی غیر حکیمانہ ہے۔ بلکہ یہ سرکشی کا فعل ہے۔ اس طرح کی تبدیلیاں صرف مسائل کو بڑھاتی ہیں۔ سماج میں بدعنوانیوں کے ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے نتیجہ میں اصلاح کے نام پر فساد ظہور میں آتا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ غلبہ کے باوجود ماضی کے ڈھانچہ کو باقی رکھا جائے، اور جن چیزوں کو بدلنا ضروری ہو ان کو بھی یکلخت نہ بدلا جائے۔ بلکہ تدریجی رفتار سے فطری انداز میں ان کے اندر تبدیلی لائی جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد بیشتر امور کو علیٰ حالہ برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے فطری عمل کے تحت اپنے آپ تمام چیزیں اسلامی رنگ میں رنگ گئیں۔

فطرت کے مطابق

مس سینڈرا اسٹرلنگ (Sandra Sterling) ایک امریکی خاتون ہیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب ان کا نیا نام عالیہ اسٹرلنگ (Alia Sterling) ہے۔ وہ امریکہ کی راجدھانی واشنگٹن میں رہتی ہیں۔

انھوں نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ایک روز مجھے گھر کی الماری میں کچھ کتابیں ملیں۔ یہ کتابیں میری ماں نے اس وقت خریدی تھیں جب کہ وہ میری دادی کے ساتھ قاہرہ میں رہتی تھیں۔ میری دادی قاہرہ کے امریکی سفارت خانے میں ایک عہدہ دار تھیں۔ ان کتابوں میں ایک قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی تھا۔ میں نے اس ترجمہ کو پڑھنا شروع کیا۔ اس کے مطالعہ سے میری دل چسپی بڑھی۔ اس کے بعد میں نے واشنگٹن سے اسلام کی تاریخ اور پیغمبر کی سیرت پر مزید کتابیں حاصل کیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ اس طرح اسلام کی طرف میرا سفر شروع ہوا۔ اسلام نے مجھے ان تمام سوالوں کا جواب دیدیا جو میرے ذہن میں موجود تھا:

Islam answered all the questions I had in mind.

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ اور یہ چیز اس کو تمام دوسرے مذاہب سے الگ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر یہودیت بھی ایک خدا کی بات کرتی ہے۔ مگر اس مذہب کے ماننے والوں کا دعویٰ ہے کہ خدا نے اپنی تمام نعمتیں صرف ایک قوم (یہود) کے لیے خاص کر دی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خدا جب ہر چیز کا خالق ہے تو اس نے اپنی نعمتوں کو کسی ایک گروہ کے لیے کیوں مخصوص کر دیا۔

دوسری طرف مسیحیت کا یہ حال ہے کہ وہ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتی ہے۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور نہ یہ سمجھ میں آتا کہ خدا کی خدائی میں کوئی اور حصہ دار ہو سکتا ہے۔ ان باتوں پر میں بہت عرصہ تک غور کرتی رہی۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

Islamic Voice, Bangalore, November 1987.

آدمی کی فطرت میں مطلوب دین کا ماڈل پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب دین حق کو جانتا ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے، کیوں کہ وہ اس کے معلوم ماڈل کے عین مطابق تھا۔

قابل عمل، ناقابل عمل

ایک دھوبی ایک روز اپنے گدھوں کو لے کر گھر سے گھاٹ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک محلّہ تھا۔ محلّہ والوں نے کہا کہ تمہارے گدھوں کو ہم اس شرط پر اپنے محلہ سے گزرنے دیں گے کہ وہ آواز نہ نکالیں، کیوں کہ گدھے کی آواز ہم کو پسند نہیں۔ دھوبی نے جواب دیا: آپ لوگوں کی یہ شرط تو میں مان سکتا ہوں کہ میرے گدھے کسی کو لات نہ ماریں، مگر یہ شرط میرے بس سے باہر ہے کہ میرے گدھے کوئی آواز نہ نکالیں۔

یہ واقعہ فرقہ وارانہ فساد کے معاملہ کو بہت خوبی کے ساتھ بتا رہا ہے۔ ہندستان کے بیشتر فسادات کی بنیاد یہ ہے کہ ایک فرقہ اپنا جلوس نکالتا ہے۔ وہ چلتے ہوئے شہر کی ایسی سڑک سے گزرتا ہے جس کے کنارے دوسرے فرقہ کے مکانات ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ مانگ کرتے ہیں کہ جلوس والے جلوس تو نکالیں مگر وہ اشتعال انگیز نعرہ نہ لگائیں۔ جلوس اس شرط کو پورا نہیں کر پاتا۔ جلوس کے کچھ افراد اشتعال انگیز نعرے لگا دیتے ہیں۔ اس پر دوسرا فرقہ بھڑک کر پتھر مارتا ہے۔ اس کے جواب میں فریق ثانی مزید مشتعل ہو کر گولیاں چلاتا ہے۔ اور پھر وہ فساد برپا ہوتا ہے جس میں ساری آبادی تہس نہس ہو کر رہ جاتی ہے۔

جلوس نکالنا بلاشبہ ایک سطحی کام ہے۔ اس میں سطحی قسم کے لوگ ہی حصہ لیتے ہیں۔ سنجیدہ اور پڑھے لکھے لوگ کبھی جلوس وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں جلوس، انسانی گدھوں کی بھیڑ کا نام ہے۔ ایسے لوگوں سے یہ مانگ کرنا کہ وہ نعرہ نہ لگائیں، سراسر ناقابل عمل ہے۔ وہ لازمی طور پر نعرہ لگائیں گے، حتی کہ دل آزار نعرے بھی۔

ہم کو چاہیے کہ ہم قابل عمل اور ناقابل عمل کے فرق کو سمجھیں۔ ہم قابل عمل کی مانگ کریں اور جو ناقابل عمل ہے اس کو نظرانداز کر دیں۔ ہم قول پر صبر کریں (المزمل ۱۰) اور عمل پر پابندی لگانے کی کوشش کریں۔ ایسے مواقع پر ہم کو نعرہ کی بات سے اعراض کرنا چاہیے۔ ہم کو ایڈمنسٹریشن سے صرف یہ مانگ کرنا چاہیے کہ وہ جلوس کو تشدد کی کارروائی کرنے سے روکے۔ ہم اگر اس حکمت کو اختیار کر لیں تو ملک سے فرقہ وارانہ فسادات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

اس دنیا میں ممکن کی مانگ ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے، اور ناممکن کی مانگ ہمیشہ ناکامیاب۔

حکمت کلام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت)

لابرویر (Jean de La Bruyere) ایک فرانسیسی مصنف ہے۔ وہ ۱۶۴۵ میں پیدا ہوا اور ۱۶۹۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے یہی بات ان لفظوں میں کہی کہ یہ بڑی بدبختی کی بات ہے کہ آدمی کے اندر نہ اتنی سمجھ ہو کہ وہ اچھا بولے، اور نہ اتنی قوت فیصلہ ہو کہ وہ چپ رہے:

It is a great misery not to have enough wit to speak well, nor enough judgement to keep quiet.

بولنے کی صلاحیت ناقابلِ بیان حد تک ایک عظیم صلاحیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ بولنے کی صلاحیت کو اگر درست طور پر استعمال کیا جائے تو وہ نعمت ہے، اور اگر بولنے کی صلاحیت کا بے جا استعمال کیا جائے تو وہ اتنی ہی بڑی مصیبت بن جاتی ہے۔

بولنے کی صلاحیت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے سوچے۔ خود کہنے سے پہلے وہ دوسروں کی سنے۔ جو لفظ بھی وہ منھ سے نکالے یہ سوچ کر نکالے کہ اس کو اپنے بولے ہوئے ایک ایک لفظ کا جواب اللہ تعالیٰ کے یہاں دینا ہے، جس کے پاس بولنے کے لیے ہو، اس کے باوجود وہ چپ رہنے کو پسند کرے۔ جو ذمہ داری کے احساس کے تحت بولے نہ کہ شوق گفتگو کے جذبہ کے تحت۔

اس کے برعکس بولنے کی صلاحیت کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی سوچے بغیر بولے۔ اس کو صرف سنانے کا شوق ہو، سننے سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ معاملات کو گہرائی کے ساتھ سمجھے بغیر وہ معاملات پر تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ اس کا بولنا خود نمائی کے لیے ہو نہ کہ اظہار حقیقت کے لیے۔

بولنا سب سے بڑا ثواب ہے، اور بولنا سب سے بڑا گناہ بھی۔ جو آدمی اس حقیقت کو جان لے، اس کا بولنا بھی بامعنی ہوگا اور اس کا چپ رہنا بھی بامعنی۔

شہادت غیر حق

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ - ۱۸۷۸) مشہور سیاسی لیڈر ہیں۔ وہ ۱۹۱۰ سے ۱۹۳۰ تک برصغیر ہند کی سیاست پر چھائے رہے۔ وہ ہندستان کو انگریز کے سیاسی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے پرجوش واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

مولانا محمد علی کی آخر عمر میں لندن میں پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی۔ وہ سمندری سفر کرکے وہاں پہنچے۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو انھوں نے کانفرنس میں ایک "معرکۃ الآرا" تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ واحد چیز جس کو لینے کا میں نے تہیہ کر رکھا ہے وہ مکمل آزادی ہے۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں اس کو پسند کروں گا کہ میں باہر کے ایک ملک میں مرجاؤں جب کہ وہ ایک آزاد ملک ہو۔ اور اگر آپ ہم کو ہندستان میں آزادی نہیں دیتے تو مجھے یہاں انگلینڈ میں آپ کو ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی:

The only thing to which I am committed is complete independence. I will not go back to a slave country. I would prefer to die in a foreign country so long as it is a free country. And if you do not give us freedom in India, you will have to give me a grave here (in England).

مذہب آزادی کے اعتبار سے یہ الفاظ بڑے شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مذہب توحید کے اعتبار سے وہ بالکل بے قیمت ہیں۔ آزادی اور سیاست کے مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی قوم آزاد ہے یا محکوم۔ مگر مذہب توحید میں اس نوعیت کی تقسیم محض اضافی ہے۔

مذہب توحید (یا اسلام) کے نقطۂ نظر سے ساری اہمیت آخرت کی ہے۔ مومن کو سب سے زیادہ جس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ لوگ جہنم سے بچیں اور جنت کے راستہ کو اختیار کریں۔ قومی سیاست کو لے کر اٹھنے والے آدمی کی نظر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ آزادی اور محکومی کا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مومن کی نظر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ جنت اور جہنم کا ہوتا ہے۔ وہ دوسری تمام باتوں کو نظر انداز کرکے اسی ایک بات پر اپنی ساری توجہ لگا دیتا ہے۔ کیوں کہ حقیقی مسئلہ صرف وہ ہے جو ابدی زندگی سے تعلق رکھتا ہو، باقی تمام مسائل اضافی اور غیر حقیقی ہیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مولانا محمد علی کی تقریر شہادت غیر حق کی مثال ہے۔ انھوں نے انگریزوں

کے سامنے یہ گواہی دی کہ سیاسی محکومی سے نجات سب سے بڑا مسئلہ ہے، حالاں کہ انھیں یہ گواہی دینا چاہئے تھا کہ جہنم کے عذاب سے نجات سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انھوں نے انگریزوں کو بتایا کہ سب سے زیادہ اعلیٰ چیز سیاسی آزادی ہے۔ حالاں کہ انھیں چاہئے تھا کہ انگریزوں کو یہ بتائیں کہ سب سے زیادہ اعلیٰ چیز جنت ہے۔ اس لئے تم لوگ اپنے رب کی رحمت و مغفرت کے طالب بنو تاکہ تم موت کے بعد جنت میں داخل ہو:

وسارعوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا السماوات والارض اعدت للمتقین (آل عمران ۱۳۳)

اور تم لوگ اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ وہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے زمانہ میں بھی سیاسی محکومی کے مسائل تھے۔ مگر وہ سیاسی محکومی سے نجات کا نعرہ لے کر نہیں اٹھے۔ بلکہ لوگوں کو توحید اور آخرت کی طرف پکارا۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں ایک بیرونی خاندان ہکسوس (Hyksos Kings) کی حکومت تھی۔ مگر حضرت یوسف نے اس بیرونی حکمرانی کو اشو نہیں بنایا جیسا کہ آپ کے بعد مصر کے قوم پرستوں نے بنایا۔ حتی کہ آپ اسی بیرونی بادشاہ کے تحت "خزائن ارض" کے شعبہ کے نگراں بن گئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں فلسطین میں رومیوں کی حکومت تھی جو باہر سے آکر فلسطین پر قابض ہو گئے تھے۔ اس وقت فلسطین میں پیلاطس (Pontius Pilate) رومی گورنر کی حیثیت سے مقیم تھا۔ مگر حضرت مسیح نے اس معاملہ کو اپنی تحریک کا اشو نہیں بنایا۔ آپ نے اپنی ساری توجہ اس پر مرتکز کر دی کہ لوگوں کو جہنم سے ڈرائیں اور انھیں جنت کی بشارت دیں۔

مومن کا کام یہ ہے کہ وہ توحید اور آخرت کو اپنی دعوت کا عنوان بنائے اور دوسری تمام چیزوں کو فیصلۂ الٰہی کے خانہ میں ڈال دے۔ مومن کا کام حق کی گواہی دینا ہے۔ اہل ایمان اگر دوسری دوسری چیزوں کو تحریک کا عنوان بنا کر اس کے لئے دھوم مچائیں تو یہ غیر حق کی شہادت کے ہم معنی ہوگا۔ اور اہل ایمان کے لئے جس خدائی نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ شہادت حق کے کام پر ہے۔ شہادت غیر حق کے کام پر انھیں ہرگز خدا کی نصرت ملنے والی نہیں۔

غیر خونی انقلاب

انسان انقلاب چاہتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ چاہتا ہے کہ یہ انقلاب غیر خونی طور پر آئے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی بھی شخص غیر خونی انقلاب لانے پر قادر نہ ہو سکا۔ تمام معلوم انقلابات قتل اور خون کے جنگل کو پار کر کے ہی ظہور میں آئے ہیں۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب تمام معلوم تاریخ کا واحد انقلاب ہے جو حقیقی معنوں میں غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر تاریخ سے حذف کر دیا جائے تو نہ صرف غیر خونی انقلاب کی یہ بات افسانہ بن کر رہ جاتی ہے بلکہ اس کے بعد کوئی ایسی عملی مثال باقی نہیں رہتی جس کی روشنی میں کوئی انسان بعد کے زمانوں میں غیر خونی انقلاب کی بات سوچ سکے۔

فرانس میں جدید جمہوری انقلاب آیا۔ اس میں عوام اور شاہی نظام کے درمیان جو مقابلے ہوئے ان میں مرنے والوں کی تعداد ۱۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ بیسویں صدی میں روس میں اشتراکی انقلاب آیا۔ اس میں جو لوگ مرے اور مارے گئے ان کی حقیقی تعداد لامعلوم ہے۔ تاہم اندازہ ہے کہ ان کی تعداد کسی حال میں ایک کروڑ سے کم نہیں۔ امریکی انقلاب (۱۷۷۵ - ۱۷۸۳) میں نسبتاً کم آدمی مرے۔ تاہم اس میں بھی مقتولین کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ عالمی جنگوں کا معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ چنانچہ پہلی عالمی جنگ میں مختلف ملکوں کے ۷۵ لاکھ آدمی مارے گئے۔ اور دوسری عالمی جنگ میں چھ کروڑ سے زیادہ آدمی ہلاک ہوئے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گئے تو ایک پورے ملک میں زبردست فکری اور اخلاقی انقلاب آچکا تھا۔ بوقت وفات ۱۲ لاکھ مربع میل کے رقبہ پر آپ کی حکومت قائم تھی۔ مگر اس پورے عمل میں صرف ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ جن میں مسلم مقتول ۲۵۹ تھے اور غیر مسلم مقتول ۷۵۹۔ یہ تعداد واقعہ کی نسبت سے اتنی کم ہے کہ وہ تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کو بلاشبہ پورے معنوں میں غیر خونی انقلاب کہا جا سکتا ہے۔

ہر قائد غیر خونی انقلاب لانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مگر کوئی قائد غیر خونی انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں غیر خونی انقلاب لانے کے لئے خود اپنے آپ کو خون کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی وہ قیمت ہے جس کو دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ خونی انقلاب ٹکراؤ

کی زمین پر آتے ہیں ، اور غیر خونی انقلاب صبر کی زمین پر۔ اور صبر سے زیادہ مشکل کوئی کام اس دنیا میں ایک انسان کے لئے نہیں۔

صبر کی حقیقت جھٹکے کو اپنے آپ پر لینا ہے ، دوسروں پر انڈیلنے کے بجائے اپنے آپ پر سہنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لڑائی کے بغیر بھی جیت ہوتی ہے۔ مگر لڑائی کے بغیر جیتنے کے لئے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے ، لوگ اپنے آپ سے لڑ نہیں پاتے ، اس لئے وہ لڑائی کے بغیر لڑائی جیتنے والے بھی نہیں بنتے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم غیر خونی انقلاب لانے میں کس طرح کامیاب ہوئے۔ اس کا اندازہ آپ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مکہ میں ۱۳ سال تک آپ کے مخالفوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ انھوں نے الفاظ کی چوٹ بھی دی اور پتھر اور نیزے کی چوٹ بھی۔ مگر اس طرح کے بے شمار واقعات پیش آنے کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بھی جوابی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اور نہ کسی سے کوئی لڑائی کی۔ آپ مخالفوں کے ہر وار کو یک طرفہ طور پر سہتے رہے۔ ان کی طرف سے ہر قسم کے اشتعال کے باوجود کبھی مشتعل نہیں ہوئے۔

اس کے بعد آپ نے یہ کیا کہ مکہ کو چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ مدینہ چلے گئے۔ آپ نے نہ اس کے خلاف فریاد کی کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اپنے وطن اور اپنی جائداد کو چھوڑنا پڑ رہا ہے اور نہ اس کی پروا کی کہ اس طرح وطن چھوڑ کر جانے کی بنا پر لوگ آپ پر بزدلی اور فرار کا الزام لگائیں گے۔

مدینہ چلے جانے کے بعد مکہ کے لوگوں نے آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس وقت بھی آپ کی پالیسی یہ رہی کہ حتی الامکان جنگ سے اعراض کیا جائے۔ مثال کے طور پر احزاب کے موقع پر آپ نے خندق کھود کر اپنے اور دشمنوں کے درمیان آڑ قائم کر دی۔ آپ نے صرف دفاع میں جنگ کی اور وہ بھی اس وقت جب کہ مڈبھیڑ کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔ ایسی باقاعدہ جنگیں صرف تین ہیں جن میں آپ خود شریک رہے ہوں (بدر ، احد اور حنین) آپ کے زمانہ میں موتہ کی جنگ بھی ہوئی۔ مگر اس میں آپ خود شریک نہ تھے۔

آپ کو عرب میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ جنگ کے ذریعہ نہیں ہوا ، بلکہ اس "صلح" کے ذریعہ ہوا جس کو قرآن میں فتح مبین (الفتح ۱) کہا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ کا واقعہ غیر خونی انقلاب لانے کے لئے اپنے آپ کو خون کرنے سے کم نہ تھا۔ آپ نے اپنی ذات کا خون کرنا گوارا کیا تاکہ باہر کی دنیا میں خون نہ بہایا جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ جنگ کے ذریعہ نہیں ہوا بلکہ دعوت کے ذریعہ ہوا۔ اسی دعوت کے بند دروازوں کو کھولنے کے لئے آپ نے یہ کیا کہ دشمن سے اس کی اپنی شرائط کی بنیاد پر صلح کرلی۔ یہ صلح حدیبیہ تھی جس کو قرآن میں کھلی فتح (انا فتحنا لک فتحا مبینا) کہا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ اس بات کا ایک تاریخی ثبوت ہے کہ جنگ کے مقابلہ میں امن کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی یک طرفہ صلح کے ذریعہ اسی عظیم حقیقت کا عملی مظاہرہ فرمایا، تاہم یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اس قسم کے ایک واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے صبر کی ضرورت ہے، اور اس دنیا میں بلاشبہ صبر سے زیادہ مشکل قربانی اور کوئی نہیں۔

دعوتی کوتاہی

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب اسلام کا ظہور ہوا، اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت عیسائیوں کی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کے دو بڑے حصے تھے۔ ایک مغربی حصہ اور دوسرا مشرقی حصہ۔ مغربی حصہ (یورپ) کو رومن ایمپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت روم (اٹلی) تھا۔ مشرقی حصہ (ایشیا اور افریقہ) کو بازنطینی ایمپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت قسطنطنیہ (ترکی) تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں شام کی سرحد پر رومیوں سے مسلمانوں کا فوجی ٹکراؤ شروع ہوا۔ اس ٹکراؤ میں مسلمان کامیاب رہے۔ ایک صدی کے اندر اندر انھوں نے مسیحی سلطنت کے مشرقی حصہ کو تقریباً پورا کا پورا فتح کر لیا جس میں ان کے مقدس مذہبی مقامات (شام اور فلسطین) بھی شامل تھے۔

اس کے بعد مسلمانوں نے ایک طرف سسلی اور اسپین کی جانب سے پیش قدمی شروع کی اور بڑھتے بڑھتے فرانس کے اندر داخل ہو گئے۔ دوسری طرف وہ ترکی کی جانب سے مشرقی یورپ میں داخل ہوئے۔ اور آگے بڑھتے ہوئے ویانا (آسٹریا) تک جا پہنچے۔ اس طرح انھوں نے مسیحی (رومی) سلطنت کے مشرقی بازو پر تقریباً پورا کا پورا قبضہ کر لیا۔ اور اسی کے ساتھ اس کے مغربی بازو کے بھی ایک حصہ کو کاٹ لیا۔

مشہور صلیبی لڑائیاں مغربی عیسائیوں کی طرف سے ان کی اسی شکست کا ردعمل تھیں۔ عیسائی دنیا ایک غیر قوم کے ہاتھ سے اپنی اس ذلت اور شکست کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے متحد ہو کر مسلم دنیا پر حملہ کر دیا۔

یہ صلیبی لڑائیاں (Crusades) وقفہ وقفہ سے تقریباً دو سو سال (۱۰۹۵-۱۲۷۱ء) تک جاری رہیں۔ اس درمیان میں عیسائیوں کو وقتی اور جزئی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں بالآخر مسلمانوں نے فتح پائی۔ اور مسیحیوں کو ان کی سابقہ دنیا سے باہر نکال دیا گیا۔ پیرس سائیکلوپیڈیا (Pears Cyclopaedia) نے اس سلسلے میں بہت بامعنی تبصرہ کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

Millions of lives and an enormous amount of treasure were sacrificed in these enterprises, and when all was done Jeruselem remained in the possession of the 'infidels'.

لاکھوں جانیں اور بے شمار دولت ان مہموں میں قربان کر دی گئی۔ اور جب سب کچھ ہو چکا تو یروشلم بدستور "بددینوں" کے قبضہ میں پڑا ہوا تھا۔

یہ واقعہ جو آٹھ سو سال پہلے عیسائیوں کے ساتھ پیش آیا تھا، ٹھیک یہی واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دوبارہ مسلمانوں کی "دو سو سالہ" قربانیوں کے باوجود "یروشلم" انھیں لوگوں کے قبضہ میں ہے جن کو مسلمان سب سے زیادہ غیر مستحق سمجھتے ہیں۔

مسیحی قومیں صلیبی جنگوں میں تو کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ کی استعماری جنگ میں انھوں نے پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ پچھلی صدیوں میں انھوں نے مسلمانوں کی تمام سلطنتوں کو مغلوب کر لیا اور پھر ساری دنیا میں ان کے اوپر براہ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی اور تہذیبی غلبہ قائم کر لیا۔

اس کے جواب میں مسلمانوں نے پورے عالم اسلام میں مغربی قوموں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ تاہم دو سو سال (تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری) کی لڑائیوں اور مقابلوں کے بعد بھی صورت حال یہ ہے کہ مسیحی اقوام کا غلبہ بدستور قائم ہے۔ "یروشلم" اب بھی دشمنان اسلام کے قبضہ میں ہے۔

بے پناہ کوششوں کے باوجود اس ناکامی کی وجہ دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنا ہے جو امت مسلمہ کا اصل منصبی فریضہ ہے۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی پر مسلمان نصرت خداوندی کے مستحق ہوتے ہیں۔ مسلمان جب تک دعوت الی اللہ کے کام کے لئے نہ کھڑے ہوں گے ان کی تمام کوششیں حبط اعمال کا شکار ہوتی رہیں گی۔ ان کا وہی حال ہوگا جو بائبل میں بنی اسرائیل کے لئے بیان کیا گیا تھا:

ذرعتم کثیرا ودخلتم قلیلا۔ تاکلون ولیس الی الشبع۔ تشربون ولا تروون۔ تکتسون ولا تدفأون۔ والآخذ اجرۃ یاخذ اجرۃ لکیس منقوب (حجی، الاصحاح الاول)

تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا، پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو، پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو، پر پیاس نہیں بجھتی۔ تم کپڑے پہنتے ہو، پر گرم نہیں ہوتے۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو (حجی، باب اول)

کامیابی کی شرط

جاپان آج متفقہ طور پر اقتصادی سپر پاور (Economic superpower) کی حیثیت رکھتا ہے۔ روایتی طور پر فوجی طاقت کسی قوم کو سپر پاور بناتی تھی۔ مگر جاپان نے اپنی مثال سے ثابت کیا کہ اقتصادی ترقی کے ذریعہ بھی ایک قوم سپر پاور بن سکتی ہے۔ مزید یہ کہ فوجی طاقت کے بل پر سپر پاور بننے والی قوم ایک حد کے بعد اپنی طاقت کھو دیتی ہے۔ جب کہ اقتصادی سپر پاور کے لیے اس قسم کی کوئی حد نہیں۔

جاپان اقتصادی سپر پاور کیسے بنا۔ وہ نعروں کی سیاست یا مطالبات کے ہنگاموں کے ذریعہ سپر پاور نہیں بنا۔ بلکہ خاموش عمل کے ذریعہ سپر پاور بنا۔ اس خاموش عمل کا اہم ترین جزء یہ تھا کہ پہلے اس نے اپنے لیے چھوٹی حیثیت کو تسلیم کیا، اس کے بعد اس کو بڑی حیثیت ملی۔ ٹوکیو کے ایک مقیم صحافی مسٹر سبھاش چکرورتی کا ایک جائزہ ٹائمس آف انڈیا (۲۷ اپریل ۱۹۹۰) میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک جزء یہاں قابل نقل ہے:

> Japan, having long recognised the U.S. as the most important external actor in Asia, is seeking to share power and influence with it without compromising Japan's own self-interests or ambitions.

جاپان لمبی مدت تک امریکہ کی یہ حیثیت تسلیم کرتا رہا کہ وہ ایشیا میں سب سے زیادہ اہم خارجی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد اب وہ وقت آیا ہے کہ جاپان اپنے مفادات یا اپنے حوصلوں کے معاملہ میں مصالحت کیے بغیر امریکہ کے ساتھ طاقت اور اثر میں حصہ دار بننے کی کوشش کرے (صفحہ ۸)

یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا اصول ہے۔ یہاں بڑا بننے کے لیے پہلے چھوٹا بننا پڑتا ہے۔ غلبہ حاصل کرنے کے لیے پہلے مغلوبیت پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ یہاں آگے بڑھنا اس کے لیے مقدر ہے جو آگے بڑھنے سے پہلے پیچھے ہٹنے کے مرحلہ کو برداشت کرے۔

اس دنیا میں کھونا پہلے ہے اور پانا اس کے بعد۔

تہذیب کی واپسی

جوائس برادرس (Dr Joyce Brothers) ایک امریکی خاتون ہیں۔ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے سائیکالوجی میں پی ایچ ڈی کیا۔ وہ نفسیاتی ڈاکٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرتی ہیں۔ ان کی تازہ کتاب کا نام کامیاب خاتون (The Successful Woman) ہے۔

جوائس برادرس کا ایک مضمون ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ (اپریل ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کے قصے لکھے ہیں جو ان سے شادی شدہ زندگی کے بارہ میں مشورہ کرنے کے لیے ملے۔ انھوں نے اپنے تجربات کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

شادی شدہ جوڑے مجھ سے جو سوالات کرتے ہیں، ان میں حالیہ برسوں میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ دس سال پہلے یہ حال تھا کہ جب میاں بیوی میں تعلقات کشیدہ ہوتے تو پہلا سوال یہ کیا جاتا تھا کہ مجھے طلاق چاہیے۔ مگر آج جو مرد اور عورت مجھ سے ملتے ہیں وہ زیادہ تر اس بات کے خواہش مند رہتے ہیں کہ ازدواجی تعلق کو کس طرح برقرار رکھا جائے:

Many of the questions couples ask me have changed in recent years. A decade ago, the first reaction when a marriage hit rough times was, "I want a divorce." But today the men and women I talk to are more likely to want permanent relationships (p.61).

مغربی دنیا میں اس سے پہلے آزادی کو خیر مطلق سمجھ لیا گیا تھا۔ مرد اور عورت مکمل آزادی کو اپنا حق سمجھنے لگے۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ کامل آزادی آخر کار کامل خواہش پرستی تک پہنچتی ہے، اور کامل خواہش پرستی کی بنیاد پر کبھی کوئی اچھا سماج نہیں بنایا جا سکتا۔

اس تلخ تجربہ کے بعد اب کامل آزادی کے بجائے محدود آزادی کا نظریہ اختیار کیا جانے لگا ہے۔ اس کی ایک مثال اوپر کے جائزہ میں نظر آتی ہے۔ کامل آزادی نے گھروں کو اجاڑا اور زندگی کو سکون سے محروم کر دیا۔ اب انسان یہ ماننے پر مجبور ہو رہا ہے کہ گھر کی آبادی اور پرسکون زندگی کو حاصل کرنے کے لیے محدود آزادی کے طریقہ کو اختیار کرنا پڑے گا۔

آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ زیادہ دیر تک فطرت سے منحرف رہے۔

اسلام کی دعوت بدلتی ہوئی دنیا میں

خدا کے جن قوانین کے تحت موجودہ دنیا چلائی جارہی ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے ـــــ اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، ڈھا دئے جاتے۔ اور خدا ضرور اس کی مدد کرے گا جو خدا کی مدد کرے۔ بے شک خدا زبردست ہے، زور والا ہے (۲۲/۴۰)

خدا کے اس قانون کا اظہار انسانی زندگی میں مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ مثلاً اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اس کا ایک نمایاں اظہار اس طرح ہوا کہ وقت کی دو بڑی جابرانہ سلطنتوں ـــــ رومی شہنشاہیت اور ساسانی شہنشاہیت کو توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد اشاعت حق کے جو آزادانہ مواقع کھلے، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام اس وقت کی آباد دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں پھیل گیا۔

یورپ میں صنعتی دور آنے کے بعد نوآبادیاتی نظام (Colonialism) دنیا پر چھا گیا۔ اس نے دوبارہ، اگرچہ نسبتاً کم تر شدت کے ساتھ، انسانی دنیا میں جبر کی صورت حال پیدا کر دی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آیا۔ دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) پیش آئی۔ اس کے نتیجہ میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتیں بے حد کمزور ہوگئیں اور آخر کار اس نظام کا خاتمہ ہوگیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون دفع کا ایک نمایاں اظہار حالیہ برسوں (۹۰ - ۱۹۸۹) میں ہوا ہے۔ اس بار اس قانون کا نشانہ کیمونسٹ ایمپائر تھی۔ کیمونسٹ روس میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ بظاہر ناقابل شکست سوویت ایمپائر ٹوٹ گئی۔ اس طرح اشاعت حق کی آخری رکاوٹ کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ بظاہر اب اس قسم کا نظام جبر دوبارہ دنیا میں آنے والا نہیں۔

مصلحت خداوندی

موجودہ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ امتحان کی مصلحت کا لازمی تقاضا ہے کہ دنیا میں آزادی کا ماحول ہو۔ یہاں ہر آدمی کے لئے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر

(الکہف ۲۹) کا موقع باقی رہے۔

ایسی حالت میں دنیا کے اندر جبر کا نظام قائم کرنا براہ راست مصلحت خداوندی کے خلاف ہے۔ کوئی شخص جب کسی علاقے میں جبر کا نظام قائم کرتا ہے تو گویا وہ خدا کے قائم کئے ہوئے نظام میں مداخلت کرتا ہے۔ خدا ایسے شخص یا گروہ کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ وہ ایسے لوگوں سے طاقت چھین کر انھیں باہر پھینک دیتا ہے۔

کچھ لوگ جہاد (بمعنی قتال) کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس کا مقصد موانع دعوت کو ہٹانا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ جہاد (بمعنی قتال) صرف دفاع کے لئے ہوتا ہے۔ جہاں تک موانع دعوت کا تعلق ہے وہ خود خدا کی طرف سے ہٹائے جاتے ہیں۔ موانع دعوت خدا کا مسئلہ ہے، وہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ ہمارا مسئلہ دعوت پہنچانا ہے، اگر ہم دعوت پہنچانے کا کام کریں تو خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ضرور موانع دعوت کا خاتمہ کر دے گا۔

بائبل کی پیشین گوئی

بائبل میں اسرائیلی پیغمبر کی زبان سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ——— وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں (حبقوق ۳ : ۶) :

وقف وقاس الارض ۔ نظر فرجف الامم ودُكّتِ الجبالُ الدهرية وخسفت آكامُ القِدَم ۔ مسالك الازل له (حبقوق ۳ : ۶)

اس پیشین گوئی کا تعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس میں "ازلی پہاڑ" اور "قدیم ٹیلے" سے مراد رومی اور ساسانی سلطنتیں ہیں۔ یہ سلطنتیں جبر پر قائم تھیں۔ انھوں نے قدیم زمانہ میں وہ چیز پیدا کر رکھی تھی جس کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے۔ اور جس کو ہنری پرین (Henri Pirenne) نے شاہانہ مطلقیت (Imperial absolutism) سے تعبیر کیا ہے۔ اس شاہانہ مطلقیت نے قدیم زمانہ میں دعوت حق کے تمام مواقع ختم کر دئے تھے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اللہ تعالیٰ نے عرب طاقت کے ذریعہ ان شہنشاہیتوں کو توڑ دیا۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار آزادانہ غور و فکر کا دور شروع ہوا۔ اس طرح وہ حالات پیدا

ہوئے جب کہ اہل حق آزادانہ طور پر خدا کے دین کی تبلیغ کریں اور لوگ آزادانہ غور وفکر کے تحت اس کو قبول کرلیں۔

دور جدید کا نظام جبر

موجودہ زمانہ میں مذکورہ قسم کی شاہانہ مطلقیت دوبارہ نئی صورت میں قائم ہوگئی۔ یہ وہ نظام جبر ہے جو کیمونسٹ نظریہ کے تحت سوویت یونین میں ۱۹۱۷ میں قائم ہوا۔ یہ جابرانہ نظام دوبارہ شدید تر صورت میں دعوت حق کی راہ میں مانع بن گیا۔ بیسویں صدی کے اس نظام جبر میں تاریخ کی سب سے بڑی طاقت کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی کہ خدا اور مذہب کو آخری حد تک انسانی زندگی سے مٹا دیا جائے۔

مگر دوبارہ خدا کا قانون دفع حرکت میں آیا۔ خدا نے اپنی برتر مداخلت کے ذریعہ اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سوویت یونین، ٹائم میگزین ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ کے لفظوں میں، سوویت ڈس یونین (Soviet Disunion) بن گیا۔

مارکسزم کا خاتمہ

۱۹۵۸ میں راقم الحروف نے ایک کتاب لکھی تھی، اس کا ٹائٹل تھا: مارکسزم، تاریخ جس کو رد کر چکی ہے۔ اس وقت لوگوں کو یہ ٹائٹل بڑا عجیب معلوم ہوا تھا، مگر آج ۱۹۹۰ میں ساری دنیا کے اخبارات ورسائل میں ایسے مضامین چھپ رہے ہیں جن کی سرخی اس قسم کی ہوتی ہے:

The Collapse of Socialist system
Soviet Empire is Crumbling
The End of Communist History
Marxism is Over
Total Failure of Communism
Fragmented Empire of the U.S.S.R.

ہندستان ٹائمس (یکم جنوری ۱۹۹۰) نے کسی مغربی اخبار سے ایک کارٹون نقل کیا تھا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک ویران قبرستان ہے۔ اس کے ایک طرف کارل مارکس کی قبر بنائی گئی ہے۔ قبر کے اوپر ایک پتھر لگا ہوا ہے۔ اس پتھر پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے:

Marx: Finally buried 1989

اسی طرح ہندستان کے دوسرے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۳ مئی ۱۹۹۰) نے اپنے پہلے صفحہ پر ایک کارٹون چھاپا تھا۔ اس میں ایک گلوب ہے جس میں دنیا کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ اس گلوب کے سامنے روسی لیڈر مسٹر گورباچیف آتشیں شیشہ (magnifying glass) لئے ہوئے کھڑے ہیں اور اس کے نقشہ میں اپنا ملک تلاش کر رہے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی بیوی سے کہہ اٹھتے ہیں کہ رئیسہ، وہ یہاں ہے، میں نے اس کو پالیا، سوویت یونین:

Raisa, It's here! I found it – the Soviet Union!

سوویت یونین میں ہونے والے اس انقلاب کا کریڈٹ ٹائم مگزین نے میخائیل گورباچیف کو دیا ہے۔ اس نے اپنا شمارہ یکم جنوری ۱۹۹۰ استثنائی طور پر گورباچیف نمبر کے طور پر نکالا ہے اور گورباچیف کو دہے کی شخصیت (Man of the Decade) قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ گورباچیف نے دنیا کو بدل دیا:

Gorbachev has transformed the world (p. 14).

اس میں شک نہیں کہ سوویت یونین میں جو انقلابی واقعہ ہوا، اس کو ظہور میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے گورباچیف کو وسیلہ بنایا ہے۔ اس معاملہ میں زیادہ بڑے پیمانہ ان کا وہی درجہ ہے جو فرانس کے جنرل ڈیگال کا تھا۔ ڈیگال نے حالات کا اعتراف کرتے ہوئے فرانس کے افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا۔ اسی طرح میخائیل گورباچیف نے اندرونی اور بیرونی حالات کا اعتراف کرتے ہوئے سوویت روس میں انقلاب کے بند دروازے کھول دئے۔ اس سلسلہ میں ٹائم کا یہ ریمارک بہت بامعنی ہے کہ گورباچیف ایک ماہر سیاست داں ہیں۔ وہ بہت سے ملکوں میں الکشن جیت سکتے ہیں مگر غالباً خود اپنے ملک میں نہیں:

A master politician, Gorbachev could win election in many countries, but probably not his own.

سوویت روس میں لائے جانے والے اس انقلاب کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک اہم پہلو وہ ہے جو مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ کمیونسٹ حکومت کے قیام (۱۹۱۷) کے بعد پورے سوویت روس میں مذہب پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اسی طرح اسلام بھی وہاں محبوس ہو کر رہ گیا تھا۔

ہزاروں مسجدیں اور مدرسے بند کر دئے گئے۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ اسلامی تعلیم یا اسلامی سرگرمیاں جرم قرار پا گئیں۔ مگر نئے انقلاب نے دوبارہ سوویت روس میں اسلامی سرگرمیوں کے دروازے کھول دئے ہیں۔

اسلام کا دور

سوویت روس میں عبادت خانے بند کر دئے گئے تھے۔ مذہب کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے ایک مستقل محکمہ قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ سوویت روس سے مکمل طور پر مذہب کے خاتمہ کی تدبیریں اختیار کرے۔ مگر آج یہ تمام چیزیں عملاً ختم ہو چکی ہیں۔

سوویت روس میں اب ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی ہیں۔ اسلامی لٹریچر شائع کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۰ میں وہاں سے ایک اسلامی جریدہ "نور الاسلام" کے نام سے نکالا گیا ہے۔ روسی حکومت کی منظوری کے تحت خود روس کی ہوائی کمپنی ایروفلاٹ نے قرآن کے ایک ملین نسخے جدہ سے ماسکو پہنچائے ہیں، جب کہ اس سے پہلے قرآن کا ایک نسخہ بھی روس کے اندر لے جانا ممنوع تھا۔

کمیونسٹ انقلاب کے بعد سوویت روس میں حج کا سفر بند کر دیا گیا تھا۔ اب خود سوویت یونین کے صدر میخائیل گورباچیف نے روسی ایئرلائن ایروفلاٹ کو ہدایت کی ہے کہ وہ روسی حاجیوں کو عرب پہنچانے کا خصوصی انتظام کرے اور اس مقصد کے لئے ماسکو، تاشقند، باکو، تاتار، قازان اور دوسرے بڑے روسی شہروں سے جدہ تک براہ راست پروازیں جاری کرے۔ اسی کے ساتھ گورباچیف نے روسی وزیر خارجہ سے کہا ہے کہ سوویت روس سے جو مسلمان حج کے لئے جانا چاہیں، ان کے لئے بسہولت ویزا جاری کیا جائے۔

سوویت روس میں اسلام کے لئے جو نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں، ان کے سلسلہ میں یہ چند باتیں بطور مثال ہیں نہ کہ بطور حصر۔ انھیں چند مثالوں سے بقیہ باتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کارل مارکس نے اپنی ایک تحریر میں مذہب کے خلاف نہایت سخت ریمارک دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ مذہب عوام کی افیون ہے:

Religion is the opium of the people.

مگر آج خود کمیونسٹ روس میں ایسے اہل علم پیدا ہو چکے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مارکسزم خود بدترین قسم کی ذہنی افیون تھی۔ مارکس خود اس افیون میں مبتلا ہوا اور دوسرے بہت سے لوگوں کو اس میں مبتلا کیا۔ اسٹالن نے روس کے ۲۵ ملین انسانوں کو یا تو ہلاک کر دیا یا انھیں سخت ترین سزائیں دیں۔ اس کے باوجود وہ کمیونسٹ نظام کو مستحکم نہ کر سکا۔

"ٹائم میگزین نے اپنے شمارہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ میں سوویت روس کے بارہ میں ایک مفصل رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نئے انقلاب کے بعد اب روس میں مذہب کی حیثیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کا بھی تفصیلی حال درج کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ روس کے تقریباً ۵۵ ملین مسلمان نئی مذہبی رواداری کا فائدہ حاصل کر رہے ہیں :

Some 55 million Soviet Muslims enjoy the fruits of new religious tolerance.

اس باتصویر رپورٹ کی سرخی نہایت بامعنی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں —— کارل مارکس محمد کے لئے جگہ خالی کرتا ہے :

Karl Marx makes room for Muhammad.

کیسا عجیب ہے یہ انقلاب جو تاریخ انسانی میں پیش آیا ہے۔

آزاد دنیا میں دور خاتمیت

یہ وہ صورت حال ہے جو دوسری دنیا (second world) میں پیش آئی۔ اسی طرح پہلی دنیا (first world) میں بھی ایک اور انداز سے دور رس تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور یہ تبدیلیاں بھی عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں۔ ان تبدیلیوں نے مغربی دنیا میں موانع دعوت کا حصار توڑ کر وہاں دعوت کے نئے وسیع تر امکانات کھول دئے ہیں۔

امریکہ کے دانشور طبقہ میں پچھلے چند برسوں میں ایک نیا فکر پیدا ہوا ہے۔ اس فکر کو خاتمیت (endism) کا نام دیا گیا ہے۔ " آزاد دنیا " نے حیرت انگیز طور پر اپنی تہذیب میں اپنے سابقہ یقین کو کھو دیا ہے۔

لامحدود آزادی کا نظریہ حقائق فطرت سے ٹکرا گیا۔ صنعتی ترقی کے مسائل نے دنیا میں جنت

تعمیر کرنے کے خواب کو برباد کر دیا۔ جاپان کی غیر متوقع اقتصادی طاقت نے مغرب کی فوجی طاقت کو غیر موثر بنا دیا۔ انسانی ساخت کے تمام نظریات اپنے تجربہ میں غیر معتبر قرار پا گئے۔ مادی ترقیاں انسان کی روح کو مطمئن کرنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ وغیرہ

ناکامیوں کی اس فہرست میں سب سے اہم اور دور رس نتائج والی ناکامی وہ ہے جو فکری سطح پر پیش آئی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اہل مغرب نے یہ یقین کر لیا تھا کہ ان کی سائنس ان کے لئے الہامی مذہب کا بدل ہے۔ سائنس فکری اعتبار سے انھیں وہ سب کچھ دے سکتی ہے جس کی امید مذہب سے کی جاتی ہے۔ مگر موجودہ صدی کے آخر میں پہنچ کر اصل سائنس نے آخری طور پر اپنے اس یقین کو کھو دیا ہے۔ اب انسان دوبارہ وہاں کھڑا ہے جہاں اس کو فکری اعتقاد اور نظریاتی یقین کے لئے دوبارہ اسی چیز کی ضرورت ہے جس کو مذہب کہا جاتا ہے۔

سائنس کی اس ناکامی پر موجودہ زمانہ میں کثیر تعداد میں کتابیں چھپی ہیں۔ ان کتابوں کا مشترک خلاصہ یہ ہے کہ سائنس کی تمام تحقیقات نے اس کو اس مقام پر پہنچایا ہے کہ انسان جو کچھ جاننا چاہتا ہے، وہ اس کو سائنسی مطالعہ کے ذریعہ نہیں جان سکتا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں انسان نے "انسائیکلو پیڈیا آف نالج" چھاپی تھی، اب موجودہ صدی کے خاتمہ پر وہ قاموس جہالت (Encyclopaedia of Ignorance) چھاپ رہا ہے۔

یہاں میں ایک کتاب کا حوالہ دوں گا جو ۱۹۸۹ میں نیو یارک سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے مصنف اسٹفن ہاکنگ (Stephen W Hawking) ہیں۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کے پروفیسر ہیں۔ میتھمیٹکس کی یہ چیر نیوٹن کے نام پر قائم کی گئی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آئن سٹائن کے بعد وہ نظریاتی طبیعیات میں سب سے زیادہ ممتاز سائنس داں ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب وقت کی مختصر تاریخ (A Brief History of Time) کو ان سطروں سے شروع کیا ہے:

ایک مشہور سائنس داں (کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ برٹرینڈ رسل) نے ایک بار فلکیات پر ایک عوامی لکچر دیا۔ اس نے بتایا کہ زمین کس طرح سورج کے گرد گھومتی ہے اور پھر سورج کس طرح کہکشاں کے مرکز کے گرد گھومتا ہے جو کہ بہت سے ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ لکچر کے آخر میں ایک چھوٹی بوڑھی عورت کمرہ کے پچھلے حصہ سے اٹھی اور کہا۔ جو کچھ تم نے ہمیں بتایا وہ لغو ہے۔ زمین درحقیقت ایک

چپٹی پلیٹ کی طرح ہے اور وہ ایک بڑے کچھوے کی پشت پر ٹکی ہوئی ہے۔ سائنس داں برتری کے احساس کے تحت مسکرایا اور پھر کہا کہ یہ کچھوا کس چیز کے اوپر ہے۔ خاتون نے کہا کہ نوجوان، تم بہت چالاک ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کچھوے کے نیچے کچھوا ہے، اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے تک چلا گیا ہے۔

بہت سے لوگ دنیا کی اس تصویر کو مضحکہ خیز سمجھیں گے کہ یہاں کچھووں کا ایک لامتناہی کھبا قائم ہے۔ مگر ہم کیوں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا علم اس سے بہتر ہے۔ ہم دنیا کی بابت کیا جانتے ہیں اور کس طرح جانتے ہیں۔ دنیا کہاں سے آئی اور وہ کہاں جا رہی ہے۔ کیا دنیا کا ایک آغاز ہے، اور اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے کیا پیش آیا۔ وقت کی نوعیت کیا ہے۔ کیا وہ کبھی ختم ہو جائے گا۔ علم طبیعیات کے حالیہ انکشافات جو نئی ٹکنالوجی کے ذریعہ ممکن ہوئے ہیں، وہ ان میں سے بعض سوالات کا کچھ جواب دیتے ہیں۔ یہ جواب آئندہ اتنے ہی بدیہی دکھائی دے سکتے ہیں جتنا کہ زمین کا سورج کے گرد گھومنا یا شاید وہ اتنے ہی مضحکہ خیز نظر آئیں جتنا کہ کچھووں کا کھبا۔ صرف وقت ہی اس کے بارہ میں کچھ بتا سکتا ہے:

A well-known scientist (Some say it was Bertrand Russell) once gave a public lecture on astronomy. He described how the earth orbits around the sun and how the sun, in turn, orbits around the center of a vast collection of stars called our galaxy. At the end of the lecture, a little old lady at the back of the room got up and said: "What you have told us is rubbish. The world is really a flat plate supported on the back of a giant tortoise." The scientist gave a superior smile before replying, "What is the tortoise standing on?" "You're very clever, young man, very clever," said the old lady. "But it's turtles all the way down!"

Most people would find the picture of our universe as an infinite tower of tortoises rather ridiculous, but why do we think we know better? What do we know about the universe, and how do we know it? Where did the universe come from and where is it going? Did the universe have a beginning, and if so, what happened before then? What is the nature of time? Will it ever come to an end? Recent breakthroughs in physics, made possible in part by fantastic new technologies, suggest answers to some of these longstanding questions. Someday these answers may seem as obvious to us as the earth orbiting the sun or perhaps as ridiculous as a tower of tortoises. Only time (whatever that may be) will tell.

ایک اور مثال

اسٹفن ہاکنگ نے اپنی کتاب میں مختلف پہلوؤں سے بحث کرکے دکھایا ہے کہ کائنات نے بے شمار امکانی ماڈلوں میں سے اسی ایک ماڈل کو اختیار کیا ہے جو انسان جیسی مخلوق کی زندگی اور

ترقی کے لئے ضروری تھا۔" کائنات ویسی کیوں ہے جیسی ہم اسے دیکھتے ہیں : ان کے الفاظ میں ، اس سوال کا جواب بالکل سادہ ہے۔ اگر کائنات کسی اور ڈھنگ کی ہوتی تو ہم یہاں موجود ہی نہ ہوتے :

"Why is the universe the way we see it?" The answer is then simple: If it had been different, we would not be here! (p. 131).

انھوں نے بگ بینگ (big bang) نظریہ کا حساب کرکے بتایا ہے کہ اس میں بے شمار ایسے پہلو ہیں جن کے متعلق ماننا پڑتا ہے کہ وہ کسی ناقابل توجیہہ سبب (unexplained reason) کی بنا پر ہوا۔ کیوں کہ معلوم مادی قوانین میں اس کی توجیہہ موجود نہیں۔

مثال کے طور پر انھوں نے بتایا ہے کہ بگ بینگ کے بعد کائنات کی جو توسیع شروع ہوئی اور جو اب تک مسلسل جاری ہے ، اس کی توسیع کی شرح (rate of expansion) انتہائی حد تک حسابی (well-calculated) ہے۔ اس توسیع کی شرح رفتار میں اگر ایک سکنڈ کے جزء (fraction) کے بقدر بھی فرق ہوتا تو کائنات اب تک منہدم ہو چکی ہوتی۔

اس قسم کی مختلف تفصیلات دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ بتانا بے حد مشکل ہے کہ کائنات اس خاص طریقہ سے کیوں شروع ہوئی ، سوا اس کے کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایک خدا کا عمل ہے جس نے چاہا کہ وہ ہمارے جیسی مخلوق پیدا کرکے یہاں رکھے :

It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us (p. 134).

کائنات کا سائنٹفک ماڈل تقاضا کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا مانا جائے۔ خدا کو نہ ماننے کی صورت میں یہ ماڈل ناقابل فہم بن کر رہ جاتا ہے۔

سائنس کی تصدیق

موجودہ زمانہ عقل (reason) کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان ہر چیز کو عقل کے معیار پر پرکھ کر اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مگر آج کے انسان نے جب موجودہ مذاہب کو عقل کے معیار پر پرکھا تو اس نے پایا کہ تمام مذاہب کی کتابیں غیر عقلی تعلیمات سے بھری ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر بائبل میں زمین پر انسان کے ظہور کی جو تاریخ دی گئی ہے، اس کے لحاظ سے حساب لگایا جائے تو ۱۹۹۱ میں زمین پر انسان کے ظہور کی مدت ۵۷۵۲ سال ہوگی۔ سائنسی نقطۂ نظر سے انسانی عمر کا یہ تعین مضحکہ خیز ہے۔ مگر اس قسم کی غیر علمی اور غیر تاریخی باتیں تمام مذہبی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ قرآن کا ہے۔ قرآن میں اس قسم کی کوئی مثال مطلق طور پر موجود نہیں۔ اس موضوع پر مختلف کتابیں چھپ چکی ہیں۔ فرانس کے ڈاکٹر موریس بوکائی (Dr Maurice Bucaille) کی مشہور کتاب (The Bible, the Qur'ān and Science) خاص اسی موضوع پر ہے جو پہلی بار فرانسیسی زبان میں ۱۹۷۶ میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب تک ۱۰ زبانوں میں اس کے ترجمے کئے جا چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر بکائی کی دوسری کتاب ۱۹۸۴ میں پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ ۲۰۲ صفحہ پر مشتمل اس کتاب کے انگریزی اڈیشن کا نام یہ ہے:

What is the Origin of Man?

ڈاکٹر موریس بوکائی نے اس کتاب میں خاص طور پر ان آیات کا مطالعہ کیا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ رحم مادر کے اندر انسان کی ابتدائی تخلیق کس طرح ہوتی ہے۔ مثلاً: اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک علقہ کی شکل دی۔ پھر علقہ کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا (۲۳/۱۲-۱۴)

ڈاکٹر بوکائی نے دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے الہام کا زمانہ ۶۱۰ سے ۶۳۲ء تک ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مشرق و مغرب میں ہر طرف علمی تاریک خیال (scientific obscurantism) کا ذہن چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس دور کی تمام کتابوں میں اس زمانہ کے غیر علمی خیالات کا انعکاس پایا جاتا ہے۔

مگر قرآن حیرت انگیز طور پر اس عمومی تاثر سے مستثنیٰ ہے۔ قرآن میں اپنے زمانہ کی کوئی ایک بھی علمی

غلطی راہ نہ پاسکی۔ حتی کہ قرآن اگر اس زمانہ کی کسی رواجی بات کو نقل کرتا ہے تو وہ صرف اس کے صحیح اجزا کو نقل کرتا ہے، اور اس کے غیر صحیح اجزاء کو حذف کرتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی نے اس سلسلہ میں ان آیتوں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے جن کا تعلق انسان کی پیدائش اور رحم مادر میں اس کے ارتقاء سے ہے۔ انھوں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ انسان کی پیدائش کے بارہ میں قرآن کے جو بیانات ہیں وہ حیرت انگیز طور پر جدید تحقیقات کے عین مطابق ہیں۔ وہ تحقیقی نتائج جو پہلی بار صرف بیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آئے ہیں، وہ ۱۴۰۰ سو سال پہلے کی کتاب قرآن میں کیوں کر موجود ہیں، یہ ظاہرہ (phenomenon) انتہائی حد تک عجیب ہے۔

ڈاکٹر بکائی اس قسم کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علم کی تاریخ ہم کو اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی موجودگی کی کوئی انسانی توجیہہ ممکن نہیں:

The history of science leads us to conclude that there can be no human explanation for the existence of these verses in the Qur'ān (p. 188).

اس طرح کی کثیر مثالیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ علم کا دریا (river of knowledge) جو لوگوں کو انیسویں صدی میں الحاد کی طرف جاتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اب بیسویں صدی میں وہ اپنا رخ موڑ کر مذہب کی طرف جا رہا ہے۔ مذہبی عقائد عین سائنٹفک سطح پر ثابت شدہ حقائق بنتے جارہے ہیں۔ مذہب آج خالص سائنس کی روشنی میں، سب سے زیادہ قابل فہم اور قابل اعتبار آئیڈیالوجی بن گیا ہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ مذہب کی صداقت کا ثابت ہونا اسلام کی صداقت کا ثابت ہونا ہے۔ کیوں کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب تبدیلی اور اضافہ کی بنا پر اپنا استناد کھو چکے ہیں۔ اب میدان میں صرف اسلام ہے جس کو مستند اور قابل قبول مذہب کا درجہ دیا جاسکے۔

سائنس کی طرف سے مایوسی

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کی سائنسی دریافتوں نے انسان کو علم سے زیادہ بے علمی تک پہنچایا ہے۔ مثلاً بلیک ہول کا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات کا صرف ۳ فی صد حصہ ہمارے لئے

قابل مشاہدہ ہے۔ بقیہ ۹۰ فی صد حصہ روشنی خارج نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے لئے قابل مشاہدہ ہی نہیں۔

یہ سادہ طور پر مادہ (mass) کی بات ہے۔ جہاں تک مادی مشاہدات کی توجیہہ کا سوال ہے تو اس معاملہ میں سائنس نے ہمیں کسی بھی یقینی جواب تک نہیں پہنچایا ہے۔ ہر چیز جس کو آدمی جاننا چاہتا ہے، بہت جلد وہ دیکھتا ہے کہ اس کی حد (limit) آگئی۔ اور اس کے آگے معاملہ کو جاننا یا سمجھنا آدمی کے لئے موجودہ حالت میں ناممکن ہے۔

ان تجربات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں آدمی نے سائنس کے بارہ میں اپنے یقین کو کھو دیا ہے۔ کمیونسٹ دنیا کا مسئلہ اگر جبر تھا، تو آزاد مغربی دنیا کا مسئلہ ذہنی گھمنڈ (intellectual arrogance) تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو سائنس کی محدودیت (Limitations) بتا کر ان کے علمی گھمنڈ کو چور چور کر دیا۔

یہاں میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کروں گا۔ اس نے "ہسٹری آف سائنس" کے آرٹیکل کے تحت لکھا ہے کہ ابھی حال تک، سائنس کی تاریخ کامیابی کی تاریخ تھی۔ سائنس کی کامیابیاں بڑھتے ہوئے علم، اور جہالت اور توہم پرستی پر فتح کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ سائنس سے ایجادات کا ایک سیلاب نکلا تھا جو انسانی زندگی کو ترقی دینے والا تھا۔ مگر حال میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار ہے۔ لامحدود ٹکنکل ترقیوں سے پیدا ہونے والے خطرات نے مورخین کو مجبور کیا ہے کہ وہ سائنس کے بارہ میں اپنے ابتدائی سادہ خیالات کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں:

> Until recently, the history of science was a story of success. The triumphs of science represented a cumulative process of increasing knowledge and a sequence of victories over ignorance and superstition; and from science flowed a stream of inventions for the improvement of human life. The recent realization of deep moral problems within science, of external forces and constraints on its development, and of dangers in uncontrolled technological change has challenged historians to a critical reassessment of this earlier simple faith. (16/366)

خلاصہ کلام

دوسری دنیا (کمیونسٹ دنیا) میں اسلامی دعوت کے لئے کام کرنے کے مواقع مسدود ہو گئے

تھے۔ اب وہاں اسلامی دعوت کے مواقع دوبارہ کھل گئے ہیں۔ جہاں تک پہلی دنیا (آزاد دنیا) کا تعلق ہے، وہاں کام کے مواقع پہلے سے موجود تھے۔ اب نئے حالات نے ان مواقع میں صرف مزید اضافہ کیا ہے۔

ان حالات میں ہماری ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اب ہمیں مزید طاقت اور سرگرمی کے ساتھ ان مواقع دعوت کو استعمال کرنے میں لگ جانا چاہئے۔

اسلام کا احیاء، اور مسلمانوں کی ترقی تمام تر دعوت کے عمل سے وابستہ ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں دعوت کے مواقع آخری حد تک کھول دئے گئے ہیں۔ اب تاریخ منتظر ہے کہ کچھ لوگ اٹھیں اور ان مواقع کو استعمال کرکے اسلام کی دعوت کو تمام بندگان خدا تک پہنچا دیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف ہر قسم کے دعوتی مواقع کے دروازے کھل گئے ہیں۔ دوسری طرف وسائل اعلام (communication) کے جدید ذرائع نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ خدا کی دعوت سارے عالم میں پہنچائی جاسکے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہو جائے جس میں آپ نے فرمایا کہ زمین کے اوپر کوئی بھی مکان یا خیمہ نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے۔ تاریخ ہمیں یہ عظیم کریڈٹ دینے کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ ہم ان ضروری شرائط کو پورا کر دیں جس کے بعد کسی کو اس قسم کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔

تجویز

اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر آخر میں میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ خاص اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ اس کمیٹی میں اہل علم اور باخبر افراد شریک ہوں۔ یہ لوگ جمع ہو کر باہم مشورہ اور غور و فکر کریں۔ اور پھر دعوتی عمل کا ایک مکمل منصوبہ بنائیں۔ اس کے بعد منظم انداز میں اس پر عمل شروع کر دیا جائے۔ مذکورہ نوعیت کی ایک کمیٹی کا قیام اس معاملہ میں صحیح اور موثر آغاز کی ضمانت ہوگا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ مشترک صفت ہے کہ وہ اپنے ملکوں کے شاکی رہتے ہیں۔ مگر یہی لوگ باہر کے ملکوں میں جاکر نہایت کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ مثلاً پاکستان اور ہندستان کے لوگ اپنے اپنے ملکوں میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ یہاں ظلم اور فساد ہے۔ مگر یہی لوگ مغرب میں یا خلیج کے ملکوں میں پہنچتے ہی ایک کامیاب زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مصر اور شام کے اسلام پسند اپنے ملکوں میں اپنی حکومت سے ٹکراؤ کے سوا کوئی اور کام نہیں جانتے۔ مگر یہی لوگ سعودی عرب اور کویت میں آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔

اس کا راز ایک لفظ میں ایڈجسٹمنٹ ہے۔ یہ لوگ اپنے ملکوں میں ایڈجسٹمنٹ نہیں کرتے، اس لئے وہ اپنے ملک میں ناکام رہتے ہیں۔ اور دوسرے ملک میں، مجبورانہ طور پر نہ کہ شعوری طور پر، ایڈجسٹمنٹ کر لیتے ہیں۔ اس لئے وہ وہاں کامیاب رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ملکوں میں "مجاہد" ہیں اور دوسرے ملکوں میں "بزدل"۔ اگر وہ اپنے ملکوں میں اسی طرح "بزدل" بن جائیں جس طرح وہ باہر کے ملکوں میں بنے ہوئے ہیں تو وہ خود اپنے ملک میں بھی وہ ساری کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں جو وہ باہر کے ملک میں حاصل کر رہے ہیں۔

اس صورت حال کا اصل نقصان عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ باہر جانے والے ذہین لوگ اپنی زبان سے یہ اعلان نہیں کرتے کہ تجربہ کے بعد ہم نے اپنی پالیسی بدل لی ہے، اسی طرح تم بھی بدل لو۔ چنانچہ عملاً یہ ہو رہا ہے کہ ان تمام نام نہاد مجاہدین کے لکھے یا بولے ہوئے الفاظ کی بنا پر ان کے ملکوں کے لوگ برابر مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔ اور وہ خود باہر کے ملک میں اپنے الفاظ کو عملاً ترک کر کے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا مستقبل تعمیر کر رہے ہیں۔

یہ سب سے بڑی برائی ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جاری ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس برائی کو جاری کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو بے خبر عوام نے برائی مٹانے کا کریڈٹ دے رکھا ہے۔ ایک صاحب کے سوال پر میں نے یہ بات کہی۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران کہا کہ اسلامی دنیا کو ہمارے دشمنوں نے پارہ پارہ کر دیا ہے (ان العالم الاسلامی مزقہ اعداؤنا)

۱۰ مئی کی شام کو موتمر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں سینیگال کے

اخباری نمائندے جمع ہوئے اور سوال وجواب کے انداز میں گفتگو ہوئی۔

مگر پریس کے نمائندوں نے جو سوالات کئے، وہ زیادہ تر سطحی نوعیت کے تھے۔ ایک صحافی نے یہ سوال کیا کہ کانفرنس نے سلمان رشدی کے بارہ میں کوئی تجویز پاس نہیں کی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال وجواب کو سن کر مجھے احساس ہوا کہ اس وقت پوری ملت اسلام قول بلافعل کی سطح پر ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہر مسلمان اس بات کو ثابت کرنے پر اپنے آخری الفاظ خرچ کردینا چاہتا ہے کہ سلمان رشدی واجب القتل ہے۔ حتی کہ وہ اس قابل ہے کہ کوئی بھی شخص اس پر قابو حاصل کرکے اس کو قتل کردے۔

مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہر شخص قتل کی بات کرتا ہے مگر کوئی شخص قتل کرنے کے لئے نہیں اٹھتا۔ حتی کہ ایران کی حکومت نے ایک سال پہلے اعلان کیا تھا کہ سلمان رشدی کے قتل کے لئے ایک اسکویڈ روانہ کردیا گیا ہے۔ مگر آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اسکویڈ کہاں گیا۔ ہندستان پاکستان یا کسی بھی ملک کے کسی مسلم دانشور یا عالم نے ایسا نہیں کیا کہ وہ خود انگلینڈ جائے یا اپنے صاحبزادہ کو وہاں بھیجے اور پھر وہ یا تو سلمان رشدی کو مارنے میں کامیاب ہو یا اسی راہ میں اپنی جان دیدے۔

حقیقت یہ ہے کہ سلمان رشدی کے واقعہ نے سلمان رشدی سے زیادہ خود موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ سلمان رشدی کی کتاب نے اگر سلمان رشدی کو شتم رسول کا مجرم ثابت کیا ہے تو مسلم لکھنے اور بولنے والوں کو قول بلافعل کا مجرم ثابت کیا ہے۔ اور دوسرا جرم یقیناً پہلے جرم سے کسی طرح کم نہیں۔

اس سفر کے دوران مجھے ایک عرب ملک کی مطبوعہ رپورٹ (۱۹۸۹) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں نام بنام دکھایا گیا تھا کہ کس ملک کو کس مد میں کتنی رقم دی گئی۔ ہندستان کے عنوان کے تحت اس رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ درج تھے:

الهند: لجنة تعمير المساجد، لاصلاح المساجد المتضررة من الزلازل $20,000 اس اندراج کے مطابق، ہندستان میں تعمیر مساجد کے لئے ایک ادارہ قائم ہے۔ اس نے ۲۰ ہزار ڈالر ان مساجد کی مرمت کے لئے حاصل کیا ہے جن کو زلزلوں سے نقصان

پہنچا ہے۔

یہ پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ "لجنۃ تعمیر المساجد" کے نام سے کوئی معروف ادارہ ہندستان میں موجود نہیں۔ اور اگر بالفرض "اسٹیمپ اور لیٹر پیڈ" کی سطح پر ایسا کوئی ادارہ کہیں موجود ہو تو یہ یقینی ہے کہ ۱۹۸۹ میں یا اس سے پہلے کے قریبی سال میں ہندستان میں کوئی زلزلہ نہیں آیا جس میں مسجدوں کو نقصان پہنچا ہو اور اس کی ضرورت پیش آئی ہو کہ باہر سے رقم لاکر ان کی مرمت کرائی جائے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کا "بارلیش طبقہ" کتنے برے انداز میں عرب ملکوں کے جذبۂ انفاق کا استحصال کر رہا ہے۔

عبد المغنی شمس الدین (عمر ۴۶ سال) کوالالمپور (مالیزیا) سے آئے تھے۔ وہ اخوانی تحریک سے متاثر ہیں۔ جامعہ ازہر کے پڑھے ہوئے ہیں، اس لئے عربی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ اختتام سے آغاز کرنا چاہتے ہیں، وہ آغاز سے اپنے عمل کی ابتدا کرنا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ وہ لفظی شور وغل اور بے فائدہ ٹکراؤ کے سوا امت کو کوئی اور چیز نہیں دے سکے۔ وہ ہر جگہ "نظام" کو توڑنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ لوگوں کے مزاج اور طرز فکر کو بدلا جائے۔

انھوں نے کہا کہ مگر فکر بدلنے کے تمام بڑے بڑے ذرائع (اسکول، ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات وغیرہ) سب حکومت کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ پھر حکومت کو بدلے بغیر طرز فکر کو بدلنے کا کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک زبردست مغالطہ ہے جس میں موجودہ مسلم مفکرین پچھلی نصف صدی سے مبتلا ہیں۔ حالانکہ واقعات نے اس کا بے معنی ہونا آخری طور پر ثابت کر دیا ہے۔

میں نے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں مکمل اقتدار ملا۔ اور سید ابو الاعلیٰ مودودی سمیت تمام اسلام پسند لوگوں نے ان کی تائید کی۔ ضیاء الحق صاحب ساڑھے گیارہ سال تک، آپ کے الفاظ میں، فکر بنانے والے تمام اداروں پر مکمل قبضہ کرکے اس کو افکار بدلنے کے لئے استعمال کرتے رہے۔ حتی کہ انھوں نے جماعت اسلامی کے افراد کو ان شعبوں کا چارج دیدیا۔

مگر ساڑھے گیارہ سال کی کوشش کے باوجود ادنیٰ درجہ میں بھی لوگوں کی فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ آج پاکستان کا ذہن پہلے سے بھی زیادہ بگڑا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ ضیاء الحق صاحب کی موت کے فوراً بعد جو عوامی الکشن ہوا، اس میں پاکستان کے عوام نے ضیاء الحق کے دور کے تمام افراد کے خلاف ووٹ دے کر انھیں ہرا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دور اول کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر حضرت ابو بکر صدیق کو خلیفہ بنایا۔ اس کا نام ذہن کی تبدیلی ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ کے لوگ عبد اللہ بن ابی جیسے کسی شخص کو اپنا حکمراں بنا لیتے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی تحریک وہاں کے لوگوں کے ذہن کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے یہی صورت ضیاء الحق صاحب کے بعد ہونے والے انتخابات میں پیش آئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تعمیر فکر کا کام ایک خالص غیر سیاسی کام ہے۔ وہ حکومت و اقتدار کے باہر انجام دیا جاتا ہے نہ کہ حکومت و اقتدار کے اندر۔

۱ مئی کی صبح کو ہمارا قافلہ توبا (Touba) کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں سینیگال کے سب سے بڑے صوفی رہتے ہیں۔ ان کا نام شیخ عبد القادر مباقی (M'Backe) ہے۔ وہ طائفہ مریدیہ کے پیر ہیں۔ اس حلقہ کو احمد بامبا نے قائم کیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ کے دروازہ پر مسکن الشیخ الخدیم لکھا ہوا تھا۔

بزرگ اپنے لباس اور حلیہ کے اعتبار سے اسی روایتی انداز میں تھے جو ہندستان کے بزرگوں کا انداز ہے۔ مگر ان کا وسیع مرکز پورے معنوں میں "ماڈرن" تھا۔ میز، قالین، صوفہ سٹ، ٹیلیفون، غرض ہر چیز موجود تھی۔ مجھے حمام (ٹائیلٹ) میں جانے کا اتفاق ہوا۔ حمام خالص مغربی طرز کا بنا ہوا تھا۔ جتنی دیر ہم لوگ شیخ کے پاس رہے، ٹیلی وژن کا عملہ مسلسل ہر چیز کو ریکارڈ کرتا رہا۔

وسیع کمرۂ ملاقات ٹیک لکڑی کا منقش انداز میں بنایا گیا تھا۔ ایک بڑی کرسی بزرگ کے لئے تھی جن کو یہاں الشیخ الاکبر کہا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ آئے۔ ایک بات نے خاص طور پر مجھے سوچنے کا موقع دیا۔ وہ یہ کہ شیخ اپنی شخصیت (پرسنالٹی) کے اعتبار سے نہایت غیر جاذب تھے۔

میں نے سوچا کہ اس کا راز کیا ہے کہ سینیگال کے لاکھوں لوگ ان پر فدا ہیں اور صدر ریاست ان کو خصوصی سلام بھجواتے ہیں۔ اس کا راز کئی سو سال کی تاریخ ہے۔

پہلے شیخ جو اپنے کو خادم رسول اللہ کہتے تھے، وہ اس مقام (توبا) میں آئے۔ انھوں نے خدمت اور تقدس کی تاریخ بنائی۔ اس کے بعد مختلف بزرگ اس تاریخ میں اضافہ کرتے رہے۔ اس طرح تقدس کی ایک لمبی تاریخ ہے جس کے اوپر موجودہ بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

ہندستان کے موجودہ تمام "شیوخ" کا حال بھی یہی ہے۔ ہر ایک کسی قدیم ادارہ یا قدیم تحریک کی بنائی ہوئی تاریخی روایات کی زمین پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک ہے خود ایک تاریخ بنانا، اور دوسری چیز ہے سابقہ تاریخ کو استعمال کرنا۔ بعد کو آنے والا زمین کے اوپر جگہ پاتا ہے، مگر تاریخ بنانے والے کے حصہ میں جو چیز آتی ہے، وہ یہ کہ وہ زمین کے نیچے دفن ہو کر رہ جائے۔

طوبیٰ میں ایک افریقی احمد بکی میرے قریب آئے۔ انھوں نے پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہند سے۔ وہ عربی میں کلام کر رہے تھے۔ انھوں نے الاسلام یتحدی کی تعریف کی۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ اس کتاب کے مصنف کو جانتے ہیں۔ کیا وہ زندہ ہیں (هل تعرف مولف هٰذا الكتاب، اهو حي)، میں خاموش رہا۔ انھوں نے کہا آپ عربی نہیں سمجھتے ہیں۔ آخر میں میں نے کہا کہ میں ہی اس کا مصنف ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیتے رہے۔

اس قسم کے واقعات میرے ساتھ ہر سفر میں پیش آتے ہیں۔ یہاں "مکتبۃ الشیخ" میں جانا ہوا۔ اس کے لائبریرین ہم لوگوں کو لائبریری کا ایک حصہ دکھا رہے تھے۔ وہ ایک الماری کے سامنے کھڑے ہوگئے اور کہا کہ ہمارے پاس ہر موضوع کی کتابیں ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے چند کتابیں نکال کر دکھائیں۔ پھر انھوں نے ایک کتاب نکالی اور دکھاتے ہوئے کہا: هٰذا الاسلام يتحدى للمفكر الاسلامي الكبير وحيد الدين خان۔ لائبریرین کے اس جملہ کو سن کر میرے ساتھی ہنس پڑے۔ انھوں نے کہا کہ وہ مصنف یہ آپ کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔

اس لائبریری کے ایک حصہ میں شیخ کی تالیفات مجلد کرکے رکھی ہوئی ہیں۔ کچھ مطبوعہ اور بیشتر قلمی۔ یہ تالیفات عقائد اور تصوف وغیرہ موضوعات پر ہیں۔ ایک کتاب میں نے دیکھی۔ اس میں تصوف اور صوفی پر بحث تھی۔ صوفی کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ صوفی وہ ہے جو انسانوں سے منقطع ہو کر اللہ سے متصل ہو جائے۔

(عربی الفاظ یاد نہیں)

۱۰ مئی کی شام کو کھانے کی میز پر دو افریقی نوجوان تھے۔ ایک کا نام شیخ احمد تیجانی کوتا تھا۔ دوسرے کا نام میں نہ پوچھ سکا۔ دوسرے ساتھی سے میں نے پوچھا کہ آپ تیجانیہ سے تعلق رکھتے ہیں یا مریدیہ سے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اس وقت سینیگال کے گھروں کا یہ حال ہے کہ ماں اور باپ تو ان دو میں سے کسی ایک طائفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر سینیگال کی نئی نسل ان باتوں میں یقین نہیں رکھتی۔ نوجوان نسل دونوں سے کٹتی جا رہی ہے۔

میں طوبیٰ کی مسجد کو دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب مجمع سے نکل کر میری طرف آئے۔ وہ میرا نام وغیرہ پوچھنے لگے۔ میں نے کہا کیا آپ نے میری عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ کو میرے بارہ میں پوچھنے کا خیال کیوں آیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں جب میں نے مجمع کو دیکھا تو میں نے آپ کے چہرہ کو منتخب کر لیا۔ کیوں کہ آپ کے چہرہ میں مجھے اسلامی عظمت دکھائی دی (لما رأيت الوجوه فقد اخترت وجهكم لما توحي من العظمة الاسلامية)

۱۱ مئی کی صبح کو جزیرہ گورے (Goree) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ ڈکار سے پانچ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جدید طرز کی مشینی کشتی جب ہم لوگوں کو لے کر سمندر کی موجوں کے اوپر تیزی سے چلنے لگی تو بے اختیار میری زبان پر یہ آیت آگئی: ولقد كرمنا بني آدم وحملناهم في البر والبحر (۱۷ / ۷۰)

جانور اپنے پیروں کے ذریعہ زمین پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کر کے خشکی کا سفر کرایا۔ مچھلیاں اپنی جسمانی محنت سے سمندر میں تیرتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو کشتیوں پر بٹھا کر سمندر کی سطح پر رواں دواں کیا۔ چڑیاں اپنے بازوؤں کے ذریعہ فضا میں اڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر فضا میں اڑنے کا انتظام کیا۔ یہ کیسا عجیب "کرمنا" کا معاملہ ہے جو انسان کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مگر انسانوں میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں کے لئے حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوں۔ شکر یہ ہے کہ آلاء اللہ کو سوچ کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور پھر زبان سے نکلے کہ خدایا تیرا شکر ہے محض ش ک ر کو دہرانے کا نام شکر نہیں۔

جزیرہ میں کار وغیرہ نہیں ہوتی۔ یہاں لوگ پیدل چلتے ہیں۔ اس لئے یہاں فضائی کثافت کا وجود نہیں ہے۔ پورا جزیرہ نہایت پرسکون اور خوشگوار ہے۔ اس جزیرہ کے تمام مکانات قدیم یورپی طرز کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں لوگوں نے سب سے پہلے اس جزیرہ کو آباد کیا تھا۔

سب سے پہلے ۱۴۴۴ء میں ہالینڈ کے لوگ اس جزیرہ میں آئے۔ پھر پرتگالی اور فرانسیسی آئے۔ سب سے آخر میں انگریز آئے۔ انگریزوں نے جزیرہ گورے پر قبضہ کرلیا۔ فرانس کا قبضہ گامبیا پر تھا۔ دونوں میں تبادلہ ہوا۔ گامبیا کو فرانس نے انگریزوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اور اس کے بدلے میں انگریزوں نے جزیرہ گورے کو فرانس کے حوالہ کر دیا۔ آجکل اس جزیرہ میں کل دو ہزار آدمی رہتے ہیں۔

جزیرہ گورے میں جو چیزیں دیکھیں، ان میں ایک وہ مکان (سلیو ہاؤس) تھا جو غلاموں کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس میں نیچے کے حصہ میں نہایت تنگ قسم کی کوٹھریاں تھیں جن میں غلام پکڑ کر بند رکھے جاتے تھے اور سمندر کے راستہ سے روانہ کئے جاتے تھے۔ اور مکان کے اوپر کے حصہ میں کشادہ اور آرام دہ کمرے تھے۔ یہاں یورپ کے سفید لوگ ٹھہرتے تھے جو غلاموں کی خرید و فروخت کے کاروبار کے لئے یہاں آتے تھے۔

غلاموں کی کوٹھری کو میں نے ناپ کر دیکھا تو کوئی تین قدم چوڑی اور چار قدم لمبی تھی اور کوئی چار قدم چوڑی اور آٹھ قدم لمبی۔ ان چھوٹی کوٹھریوں میں ایک سو اور دو سو آدمی جانوروں سے بدتر انداز میں بھر دئے جاتے تھے۔ انھیں دن میں صرف ایک بار قضائے حاجت کے لئے نکالا جاتا تھا۔ یہاں اس زمانہ کے بہت سے سامان اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً لوہے کی وہ ہتھکڑی جس میں انھیں باندھ دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی وحشیانہ چیزیں تھیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

غلاموں کا یہ گھر پندرھویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ اس زمانہ میں امریکہ کی دریافت نے غلاموں کی تجارت (Slave trade) بہت بڑھا دی۔ امریکہ میں زرخیز زمین بہت تھی۔ مگر وہاں کام کے لئے آدمی نہیں تھے۔ چنانچہ یورپی قوموں نے افریقہ سے غلاموں کو پکڑ کر وہاں بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ زرعی مزدور کے طور پر استعمال کئے جاسکیں۔ یہ لوگ کالے انسانوں کو ایک قسم کا حیوان سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ افریقہ آکر اس طرح ان کو پکڑتے تھے جیسے جنگلوں میں جانور پکڑے جاتے ہیں۔ اور پھر نہایت وحشیانہ اور بے دردانہ انداز میں ان کو سمندری جہازوں میں بھر کر امریکہ لے جاکر انھیں

بیچتے تھے۔ اس غیر انسانی تجارت میں ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی، انگریز سب شریک تھے۔

جزیرہ گورے میں قدیم طرز کی مگر صاف ستھری خوب صورت مسجد ہے۔ اس میں کوئی گنبد نہیں ہے۔ مسجد کے ایک طرف پہاڑی ہے اور دوسری طرف سمندر۔ یہاں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی۔ اور پھر امام سے ملاقات کی۔ امام صاحب نے بتایا کہ یہ مسجد افریقہ کی چند قدیم مسجدوں میں سے ایک ہے۔

نئی دہلی میں سینیگال کے سفارت خانہ کی طرف سے کچھ تعارفی لٹریچر دیا گیا تھا۔ ایک پمفلٹ میں جزیرہ گورے کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ یہاں غلام گھر ہے جس کا دروازہ سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ یہ انسان کے اوپر انسان کے ظلم کی ایک دہشت ناک یاددہانی ہے:

The slaves house with its door opened on the ocean is a terrible reminder of the cruelty of men towards men.

ان الفاظ کو پڑھ کر صرف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جزیرہ گورے میں کوئی عمارت ہے جس کو "غلام گھر" کہا جاتا ہے۔ مگر جب میں نے وہاں جا کر غلام گھر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور زنجیریں اور دوسری چیزیں دیکھیں تو اندازہ ہوا کہ واقعی سیاہ فام لوگوں کے ساتھ کتنا زیادہ ظلم کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم یہ مشاہدہ بھی آخری نہیں۔ اس سے زیادہ دہشت ناک مشاہدہ وہ ہوگا جب کہ آدمی اس وقت وہاں موجود ہو جب کہ یہ انسانیت سوز واقعہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے سیاہ فام لوگوں کے ساتھ عملاً حیوانی سلوک ہوتے ہوئے دیکھے۔ موجودہ زمانہ میں اہل مغرب نے "نیگرو" اور دوسرے ناموں سے کچھ فلمیں بنائی ہیں۔ ان میں ایکٹنگ کے ذریعہ وہ تمام قدیم مناظر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مگر یہ دیکھنا بھی آخری دیکھنا نہیں۔ اس سے بڑا اور آخری مشاہدہ وہ ہے جب کہ کوئی شخص دونوں کی اندرونی حالت کو دیکھ سکے۔ ایک طرف وہ سفید فام لوگوں کے اندرون کو دیکھے کہ کس شقاوت کے ساتھ وہ اس فعل کو انجام دے رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ سیاہ فام مظلوموں کے دلوں کی حالت جان سکے کہ کس طرح ذلت اور ظلم کی اس ناقابل برداشت صورت کو وہ برداشت کر رہے ہیں۔

یہ آخری حقیقت صرف خدا دیکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انسانوں کا عادلانہ حساب کر سکے۔

۱۱ مئی کو جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے لئے ہم لوگ دکار کی جامع مسجد میں لے جائے گئے۔ یہ مسجد جامع قرویین کے طرز پر بنی ہوئی تھی، اس کا ہر جزء دہلی کی مساجد سے مختلف تھا۔ اندر داخل ہوا تو وسیع مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ گیٹ پر عمومی اعلان ہو رہا تھا کہ جوتا اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میں بھی جوتا اپنے ہاتھ میں لے کر اندر داخل ہوا۔

میزبانوں کی رہنمائی میں ہم لوگ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک پہلی صف میں پہنچ گئے۔ اتنے میں ایک افریقی بزرگ نے جوتا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں اس قسم کے تکلف سے گھبراتا ہوں۔ کیوں کہ نماز کے بعد اگر وہ صاحب مجھے نہ ملیں تو دوسرے کے رکھے ہوئے سامان کو تلاش کرنا میرے لئے سخت مشکل ہو جائے گا۔ مگر جب میں نماز سے فارغ ہو کر اٹھا تو مذکورہ افریقی میرا جوتا لئے ہوئے میرے پیچھے موجود تھے۔

میں اگلی صف میں امام کے قریب تھا۔ سنت پڑھ کر میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ مسجد کی چھت کے اوپر سے شاید کوئی بیلی کاپٹر گزر رہا ہے۔ مگر دیکھا تو "دیوار" کے اندر سے ایک بہت بڑا لکڑی کا ڈھانچہ برآمد ہو رہا تھا۔ یہ منبر تھا۔ جو بھاری بھاری موٹی لکڑیوں سے منقش انداز میں بنایا گیا تھا۔ وہ ریل کے ڈبہ کی طرح لکڑی کے پہیہ پر ہوتا ہے۔ اس کو دیوار کے پیچھے ایک مخصوص کمرہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور خطبہ کے وقت کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کو اس سے پہلے میں نے جامع قرویین میں دیکھا تھا۔

امام صاحب منبر پر بیٹھے تو حسب معمول مسجد کے اندر موذن نے کھڑے ہو کر دوسری اذان دی۔ اذان ختم ہوئی۔ میں آغاز خطبہ کا منتظر تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ امام صاحب بدستور بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں مسجد کے ایک گوشہ سے "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی آواز بلند ہوئی۔ میں متحیر تھا کہ یہ کیا ہے۔ میرے ساتھی نے اپنے ہاتھ کی تین انگلیاں اٹھا کر اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں خطبہ سے پہلے تین اذانیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک کے بعد ایک تین اذانیں ہوئیں۔ اس کے بعد امام

۱ سوویت روس کی حکومت کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے سوویت روس کا سفر کیا۔ یہ سفر ۲۸ جولائی ۱۹۹۰ کو شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں وہ ماسکو اور تاشقند گئے۔ اس کی تفصیلی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۲ دہلی کے ہندی اخبار جن ستہ کے نمائندہ مسٹر ایس کرمانی نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو جن ستہ کے شمارہ ۳ جولائی ۱۹۹۰ میں شائع ہوا ہے۔ جن ستہ انگریزی اخبار انڈین اکسپریس کا ہندی اڈیشن ہے۔

۳ نئی دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پر ایک آل انڈیا سیمینار ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کے منتظمین کی دعوت پر ۵ اگست ۱۹۹۰ کو اس کی ایک نشست میں شرکت کی اور مولانا حفظ الرحمٰن اور علماء ہند کے کارناموں کی بابت ایک تقریر کی۔ خاص طور پر یہ بتایا کہ موجودہ ہندستان میں ان علماء کے رول کی اہمیت کیا ہے۔

۴ اردو اکادمی نے دہلی کی ۲۷ لائبریریوں میں اپنی طرف سے الرسالہ اردو جاری کرایا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا تعاون ہے۔ اس کے لئے ہم اردو اکادمی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس کے ذریعہ سے سیکڑوں نئے لوگ الرسالہ سے استفادہ کر سکیں گے۔

۵ احمد آباد سے ایک گجراتی ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام چھیپا بلیٹن ہے۔ اس پرچہ میں ایک مستقل کالم ہے جس کا عنوان ہوتا ہے "میری آواز سنو"۔ اس عنوان کے تحت ہر مہینہ الرسالہ کا کوئی مضمون گجراتی میں ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ ماہانہ اشاعت کا یہ سلسلہ کئی سال سے جاری ہے۔ یہ بات پروفیسر فرید محمد محمود جی بلو والا نے ۱۷ جون ۱۹۹۰ کی ملاقات میں بتائی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہمارے قارئین سب سے پہلے اسی کالم کو پڑھتے ہیں۔

۶ لئیق محمد خاں صاحب (بنگلور) نے بتایا کہ بنگلور میں انھوں نے قارئین الرسالہ کا ایک حلقہ بنایا ہے۔ اس کے تعاون سے وہ لوگ مختلف دعوتی کام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً وہ الرسالہ اردو اور انگریزی کے منتخب مضامین کی فوٹو کاپیاں تیار کرتے ہیں اور ہاکر کے ذریعہ ان کاپیوں کو اخبارات میں ڈال کر لوگوں کے گھروں میں پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح اور دوسرے طریقہ سے الرسالہ مشن کو

لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔

۷ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے ۲۰ جون ۱۹۹۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو لیا جو اکسٹرنل سروس سے نشر کیا گیا۔ یہ انٹرویو ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ انٹرویور آل انڈیا ریڈیو کے مسٹر مجیب صدیقی تھے۔ سوالات زیادہ تر برصغیر ہند کے مسلانوں کے موجودہ مسائل سے متعلق تھے۔ اس انٹرویو کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۸ جناب حبیب بھائی (حیدر آباد) نے بتایا کہ ایک روز وہ الرسالہ ہاتھ میں لئے ہوئے اس کو پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب نے دیکھ کر پوچھا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ الرسالہ کیا ہے۔ حبیب بھائی نے کہا کہ "یہ مارل بلڈر ہے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کے قارئین الرسالہ کو کیا حیثیت دیتے ہیں۔

۹ محمد ریاض الحنفی (نیوجرسی) ایک امریکی مسلمان ہیں۔ ان کی مادری زبان انگریزی ہے۔ انھوں نے اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں پڑھی ہیں اور انگریزی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج ہم ایک ورلڈ آف لاجک میں رہ رہے ہیں۔ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات اسی آج کی زبان میں اسلام کی دعوت کو پیش کرتی ہیں۔ مغربی دنیا کو آج ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے۔ "گاڈ ارائزز" کے بارہ میں انھوں نے اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا:

Before reading this book I knew that Islam was correct, but after reading I now know why Islam is correct.

۱۰ مولانا محمد شعیب کوٹی سعودی عرب سے لکھتے ہیں: میں کئی سال سے شرورہ میں ہوں۔ یہ سعودی عرب میں یمن کی سرحد پر واقع ایک شہر ہے۔ میں اپنے ذرائع سے الرسالہ کے اردو اور انگلش دونوں اڈیشن حاصل کرتا ہوں۔ یہاں شرورہ میں الرسالہ کے پڑھنے والوں کا حلقہ خاصا وسیع اور روقیع ہے۔ اس سے پہلے میں تبوک میں تھا تو وہاں بھی کئی حضرات سے الرسالہ کا تعارف ہوا۔ میں کوشش میں ہوں کہ پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ اپنے ساتھ کام کرنے والے فلپینی حضرات کو مطالعہ کراؤں۔ اس سے پہلے وہ لوگ الرسالہ انگریزی کے کئی شماروں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔

۱۱ اسلامی مرکز کی مطبوعات ہدیۃً ارسال کرنے کے لیے ہمیں دینی درسگاہوں، اردو لائبریریوں، اسکولوں اور کالجوں کے پتے مطلوب ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنے علاقے میں واقع دینی مدارس اور دوسرے علمی اداروں کے پتے مختصر تعارف کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ اگر اداروں کے ذمہ دار حضرات کو اس پہلو پر توجہ دلاکر ان کا مطبوعہ تعارف نامہ روانہ کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

ایک صاحب لکھتے ہیں : الرسالہ مئی ۱۹۹۰ ہماری بستی کے قاری دلشاد احمد رحیمی لے کر آئے جو بیت العلوم (پیپلی مزرعہ) میں مدرس ہیں۔ موصوف نے مسجد میں تمام مقتدیوں کو کئی روز تک بعد نماز سنایا۔ اس کے مضامین سے دل بے چین ہوا اور سمجھا کہ الرسالہ سے وابستگی ایک دینی حمیت اور وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انشاء اللہ میں اس کو ضرور اپنے حلقہ احباب میں پہنچاؤں گا (عطاء الرحمٰن پردھان، بہیٹ) اس طرح کے ہزاروں لوگ ہیں جو الرسالہ کا صرف ایک شمارہ دیکھ کر اس سے متاثر ہوگئے اور اس کو پڑھنے اور پڑھانے میں لگ گئے۔

۱۳ مولانا خلیل احمد امین (ترکیسر) کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ الرسالہ کے صبر و اعراض کے اصول سے مکمل اتفاق رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں مسلسل لوگوں کو اس کی نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے ہزاروں لوگ ہیں جو الرسالہ سے متفق ہو کر ان باتوں کو عوام کے اندر پھیلا رہے ہیں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک

۱۴ محمد نورعالم صاحب (ستی پور) نے بتایا کہ وہ ایجنسی کے طور پر الرسالہ کی پانچ کاپی منگاتے ہیں ایک پرچہ اپنے پاس رکھ کر بقیہ چار پرچے لوگوں کو تقسیم کردیتے ہیں، خواہ وہ قیمت دیں یا نہ دیں۔ بہت سے دوسرے لوگ بھی اسی طرح کر رہے ہیں۔

۱۵ ڈاکٹر عمر خالدی بوسٹن (امریکہ) کی یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ آجکل وہ " ہندستانی مسلمان اور سیاست " کے موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ۸ اگست ۱۹۹۰ کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے، جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ	
قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

RNI 28822/76 □ November 1990 No. 168 □ **Rs. 5**

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	Rs 150/-
" " جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	55/-
صراط مستقیم	35/-
خاتون اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہ عمل	
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوال حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیات اسلام	
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیات طیبہ	5/-
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر۱ ایمان	25/-
نمبر۲ جدید امکانات	25/-
نمبر۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر۴ اتحاد	25/-
نمبر۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر۶ سنت رسول	25/-
نمبر۷ میدان عمل	25/-
نمبر۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

U(SE)12/86